کشمیری لال ذاکر
چنار چنار چہرے

چنار چنار چہرے

(افسانے)

کشمیری لال ذاکر

ادارہ فکرِ جدید
دریا گنج۔ نئی دھلی۔ ۱۱۰۰۰۲

قیمت	ایک سو روپے -/۱۰۰
اشاعت	۱۹۹۴ء
کتابت	عبدالفتاح ربّانی بستوی
طباعت	انیس آفسیٹ پرنٹرز - دہلی-۶
ناشر	**اِدارہ فکرِ جدید**

۹۲۲، کوچہ روہیلا، تراہا بہرام
دریا گنج - نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-85785-17-1

CHINAR - CHINAR CHEHRE KASHMIRI LAL ZAKIR

STORIES

Rs.100-00

چودھری بھجن لال صاحب

وزیرِ اعلا ہریانہ

کی

نذر

فہرست

کہانی اِس کتاب کی

آپ کسی بھی زبان کے ادب کو لے لیں، ہر زبان کے بیشتر ادیبوں نے اپنی تخلیقات کا آغاز افسانے سے ہی کیا۔ آپ گنتی کے ہی چند ایسے ادیبوں کا نام لے سکیں گے، جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا ہو۔ تقریباً سبھی ادیبوں نے پہلے کہانیاں لکھیں اور ادبی دنیا میں انہیں کے حوالے سے وہ جانے گئے۔ ناول لکھنے تو انہوں نے بعد میں شروع کئے۔ اُردو ادب میں تو ایسے بہت سے ادیب ہیں، جن کی تمام تر توجہ افسانے پر ہی مرکوز رہی۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو کو تو ادب میں اونچا مقام ان کے افسانوں نے ہی دلایا۔

اور پھر ہند و پاک میں جتنے بھی مقبول اور ممتاز رسائل ہیں، ان سبھی میں تو کہانیاں ہی چھپتی ہیں۔ چاہے وہ ان کے عام شمارے ہوں یا خاص شمارے۔ میری دانست میں تو ایک بھی ایسا جانا پہچانا میگزین نہیں جس نے صرف ناول ہی چھاپے ہوں یا ناول نمبر چھاپے ہوں۔ مجھ سے تو آج تک کسی رسالے کے ایڈیٹر نے یہ فرمائش نہیں کی کہ میں اسے اپنا مکمل ناول دیدوں رسالے میں چھاپنے کیلئے۔ سب نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ناولٹ تک ہی محدود رکھا۔ البتہ ناولوں کو قسط وار چھاپنے کا رواج ضرور ہے۔ خود میرے اپنے ناول قسط وار چھپے ہیں اور چھپ رہے ہیں۔

یہ ساری بات کہنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ادیب تو بنیادی طور سے افسانے سے ہی جُڑا ہوا ہے۔ وہ خالصتاً ناول نگار نہیں ہے۔ اسے تو زندگی کا کوئی ٹکڑا، قارئین کے سامنے، اپنے تجربے اور مشاہدے کی مدد سے پیش کرنا ہے جو اکثر کہانی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ لیکن جب کسی مرکزی خیال کو اپنی تکمیل کیلئے ایک بڑے کینوس کی ضرورت ہو، تو اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے افسانے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ناول کی شکل میں تخلیق کیا جائے۔ لیکن قاری کی بنیادی ضرورت افسانہ ہے، جسے وہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے اور اس کے تاثر سے لطف اندوز ہو۔

اس افراتفری اور بھاگ دوڑ کی زندگی میں، ایک عام آدمی کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے، کہ وہ دو ڈھائی سو صفحات کا ناول پڑھنا شروع کرے اور جب تک ختم نہ ہو جائے اسے چھوڑے نہیں۔ اب فاسٹ فوڈ اور انسٹینٹ

ڈرنکس کے زمانے میں تو لوگ پانچ دس سطروں کی منی کہانیوں کو پسند کرتے ہیں، طویل کہانیوں کو نہیں۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا ہو۔ وقت بھی کم خرچ ہو، زیادہ رقم بھی نہ لگے اور تفریح بھی ہو جائے۔ البتہ یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس قسم کے فاسٹ لٹریچر کو ادب میں کیا مقام حاصل ہوگا۔ ارے صاحب! اس کے بارے میں کون آخری فیصلہ کر سکتا ہے، کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے چاہے وہ سنجیدہ ادب ہے یا غیر سنجیدہ ادب! اسکی زندگی کی میعاد کتنی ہے، وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا یا کتنی مدت کے بعد مر جائے گا؟

فاسٹ فوڈ والا تجربہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ کیونکہ میڈیکل فیلڈ کے ایکسپرٹس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اس قسم کے کھانے صحت کیلئے مُضر ہوتے ہیں اور انہیں استعمال کرنے سے کئی قسم کی بیماریوں کا خطرہ ہے۔ لیکن ان کی پبلسٹی خوب ہو رہی ہے، اخباروں میں، ریڈیو میں، ٹیلی ویژن پر۔ میں نے سُنا ہے کہ اکتیس ۳۱ مئی، جسے اینٹی سموکنگ ڈے کے طور پر منایا گیا تھا، کے بعد حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ سگرٹ کے ہر پیکٹ پر بڑے بڑے حروف میں یہ بھی چھاپا جائے گا، کہ سموکنگ سے پھیپھڑوں کی اور دل کی بیماریاں ہوتی ہیں اور گلے کا کینسر ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ شک ہے کہ اگلے سال جب اینٹی سموکنگ ڈے آئے گا تو اس وقت تک تمباکو پینے والوں کی تعداد اور بڑھ چکی ہوگی۔ جس طرح تعلیم بالغاں کی ہر تحریک کے بعد اَن پڑھ لوگوں کی تعداد میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ جینے کا انداز بدلا جائے۔ کوالٹی آف لائف بہتر بنائی جائے۔ ورنہ نئے نئے نعروں سے کیا ہوگا؟

بات ہاتھ سے نکل گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی بھی شعبے یا کسی بھی صنف کو بڑھاوا دینے کے لئے پبلسٹی کی ضرورت ہے۔ ادب میں یہ کام نقاد کرتا ہے۔ نقاد کی شخصیت ایک طرح سے ماس میڈیا کا ایک بہت بڑا اِدارہ ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنی کسی کہانی یا ناول یا نظم کا ادب میں نمایاں طور پر ذکر کروانا چاہتا ہے۔ تو وہ ماس میڈیا کے اس اِدارے کی مدد حاصل کرے۔ یہ ادارہ جتنا زیادہ ملٹی ڈائی مینشنل ہوگا کسی ادیب یا شاعر کی پبلسٹی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اور اگر وہ ادیب زرا مالدار قسم کا آدمی ہو یا کسی ممتاز سرکاری عہدے پر فائز ہو اور دوسروں کو مناسب یا غیر مناسب فائدہ پہونچا سکتا ہو تو اس کی پبلسٹی کا چینل بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ورنہ آپ ساری عمر جھک مارتے رہیئے۔ اچھی سے اچھی کہانیاں لکھیئے، خوبصورت سے خوبصورت شعروں کی تخلیق کیجئے۔ بڑے نازک سماجی مسئلوں پر ناول لکھیئے۔ آپ کو کوئی لفٹ نہیں دے گا۔

اس لحاظ سے تو نقاد کا رول بڑا اہم ہے۔ وہ آپ کو "اوور نائٹ" مشہور کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نقاد کا کسی اچھی تخلیق میں بھی کوئی رول ہے؟ میرا خیال ہے ایک دم کوئی رول نہیں۔ اس کا رول نیگیٹو تو ہو سکتا ہے، پازیٹو قطعی طور پر نہیں۔ ادب میں اگر کسی کا رول ہے تو ان سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کا ہے جنہیں "عوام" کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جن سے وابستہ ہو کر کسی تخلیق کار کو اپنی تخلیقات کیلئے تھیم ملتے ہیں، مرکزی خیال دستیاب ہوتے ہیں، موضوعات حاصل ہوتے ہیں۔ ادب کا سب سے بڑا نقاد ایک عام آدمی ہے، جو کوئی کتاب خرید کر پڑھتا ہے یا لائبریری سے اشو کرا کر پڑھتا ہے یا کسی نقاد کے گھر سے چُرا کر پڑھتا ہے۔ کیونکہ سوائے چند سر پھرے تخلیق کاروں

کے سبھی تخلیق کار اپنی کتابوں کی پہلی جلدیں نقادوں کو ہی پیش کرتے ہیں، جو ماس میڈیا کے مضبوط اِدارے ہیں اور جن کی ذاتی لائبریریوں میں آپکو بہت سی ایسی کتابیں بھی مل جائیں گی جنہیں کھولا تک نہیں گیا۔

بات پھر ہاتھ سے نکل گئی۔ دراصل فکشن کے آدمی میں سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ وہ اپنی بات پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ ناول نگار ہے تو پھر کنٹرول اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ تقریباً پندرہ برس تک میں نے صرف افسانے اور ڈرامے ہی لکھے۔ ناول لکھنے تو بہت بعد میں شروع کئے۔ یعنی بنیادی طور پر میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ لیکن اب معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی پبلشر مجھ سے بات کرتا ہے تو یہی کہتا ہے۔" ذاکر صاحب آپ نیا ناول کون سا لکھ رہے ہیں ؟ ناول مکمل ہوتے ہی مجھے دے دیجئے تین چار مہینوں میں چھاپ دوں گا۔ ابھی پچھلے دنوں آپ کا فلاں افسانہ فلاں رسالے کے خاص نمبر میں پڑھا تھا۔ بے حد خوبصورت تھا۔"

پبلشر کا اِنٹرسٹ ناول میں ہے، افسانے میں نہیں۔ ناول کی سیل ہے۔ افسانے کم بکتے ہیں۔ پچھلے تین سال میں میرا کوئی افسانوی مجموعہ نہیں چھپا حالانکہ آدھی درجن ناول چھپ چکے ہیں۔ لگا یہ کہ ادیب بھی مینوفیکچرر ہے۔ ناول کی سیل ویلیو زیادہ ہے۔ افسانے کی سیل ویلیو کم ہے۔ اس لئے اسے مارکیٹ سٹڈی کرنی چاہیئے اور اس کے مطابق "مال" تیار کرنا چاہیئے۔ افسانہ سمال سکیل انڈسٹری کے زمرے میں آتا ہے۔ ناول لارج سکیل انڈسٹری میں، لہٰذا معاملہ خالصتاً اقتصادی ہے۔ ادبی بالکل نہیں۔ اقتصادی آئیٹم پر ادبی لیبل چسپاں کرو جبھی مارکیٹ میں جم پاؤگے ورنہ نہیں۔ اور اگر آپ اپنے اس پروجیکٹ میں دو ایک نقادوں کو بھی شامل کر لیں تو پھر سمجھئے آپ کے وارے نیارے ہو گئے۔

ہوا یہ کہ پچھلے دو سالوں میں کسی بھی پبلشر نے مجھ سے یہ تقاضا نہیں کیا کہ میں اسے اپنا کوئی افسانوی مجموعہ چھاپنے کے لئے دوں۔ سیمانت پرکاشن کے نریندر ناتھ سوز نے کوئی چار برس پہلے میرا ناول "سمندر، صلیب اور روح" چھاپا تھا۔ ناول خوبصورت تھا، پڑھنے والوں نے پسند کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سوز سے دو ایک برسوں میں ملاقات تک نہیں ہوئی، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مصنف تو پبلشروں کے ہاں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ کبھی رائیلٹی حاصل کرنے کے لئے اور کبھی نئی کتاب چھپوانے کی غرض سے۔ یہ مسئلہ اقتصادی بھی ہے اور پبلک ریلیشننگ کا بھی۔ میرا جھگڑا یہ ہے کہ نہ میں اقتصادی آدمی ہوں اور نہ پبلک ریلیشنز کا بس۔ نریندر ناتھ سوز سے ملاقات ہو ہی نہ پائی۔

جون کے مہینے کی بات ہے۔ نیشنل سکول آف ڈرامہ والوں نے میرے ناول "کرماں والی" کو سٹیج کیلئے ایڈیپٹ کیا تھا اور اسے سات جون سے گیارہ جون تک کامانی آڈیٹوریم نئی دہلی میں سٹیج کر رہے تھے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اُردو اور ہندی کے اپنے سبھی پبلشرز سے کہوں کہ وہ "کرماں والی" ضرور دیکھیں۔ پہلے شو کے بعد سے اخباروں میں اس کے بہت چرچے تھے، چنانچہ سب سے پہلے میں نے پریم گوپال متل کو ٹیلی فون کیا کہ وہ ڈرامہ دیکھنے آئے۔ اس لئے کہ اس نے "کرماں والی" اُردو میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد دِشا پرکاشن کے مدھودیپ کو ٹیلی فون کیا، جس نے میرا یہ ناول بڑی خوبصورتی سے ہندی میں چھاپا تھا۔ مہاراج کرشن رینہ نے کہیں سے خرید کر اسے پڑھا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے ٹیلی ویژن پر سیریلائز کرے۔ اس بیچ میں اس کا معاہدہ نیشنل سکول آف ڈرامہ کے پروفیسر رام گوپال بجاج اور ڈائریکٹر

کیرتی جین سے ہوگیا اور طے ہوا کہ وہ لوگ "کرماں والی" کو پہلے سٹیج کریں گے۔ پہلے چار دنوں میں کنور مہندر سنگھ بیدی، ایچ اے براری، سابق گورنر ہریانہ، سید مظفر حسین برنی، چیئرمین اقلیتی کمیشن، بنارسی داس گپتا، وزیراعلیٰ ہریانہ یہ ڈرامہ دیکھ چکے تھے۔ دس جون کو اندر کمار گجرال وزیر خارجہ اور ان کی شریکِ حیات محترمہ شیلا گجرال بھی ڈرامہ دیکھنے آئے۔ سبھی بزرگوں اور دوستوں نے رینہ، بجاج، کیرتی جین، ریپرٹری گروپ اور میری بے حد تعریف کی تھی۔ نیشنل ہیپر زنے "کرماں والی" کے بارے میں بہت اچھے کومنٹس دیئے تھے۔

اسی سلسلے میں میں نے نریندر ناتھ سوز کو بھی ٹیلی فون کیا کیونکہ وہ بھی میرا پبلشر ہے۔ یہ گیارہ جون کی بات ہے، جس دن آخری شو تھا۔ اس روز تو خیر میرے ملاحوں اور دوستوں کی ایک بھیڑ تھی جو ڈرامہ دیکھنے آ رہے تھے۔ سوز نے دعوت نامہ کیلئے میرا شکریہ ادا کیا اور خوش بھی ہوا کہ میں نے ایک عرصہ کے بعد اس سے ٹیلی فون پر بات کی تھی اور پوچھا۔

"آپ کون سا ناول لکھ رہے ہیں آج کل ؟"

"لکھ تو رہا ہوں لیکن مکمل ہونے میں ابھی دیر لگے گی۔"

"تو کچھ اور دے دیجئے چھاپنے کو۔ "سیندور کی راکھ" کو دوبارہ چھاپنے کی بات تو دو سال پہلے ہوئی تھی۔ آپ تو وہ بھی بھول گئے، وہ ناول تو دیدیں۔"

"میں اسے ایک نظر دیکھ لوں تو حاضر کردوں گا۔"

"تو اپنے منتخب افسانے دیدیں۔ میں منتخب افسانوں کی سیریز چھاپ رہا ہوں آج کل۔"

مجھے لگا نریندر ناتھ سوز مختلف قسم کا پبلشر تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ پچھلے دو برس کے دوران میں نے کیوں اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ تو نریندر ناتھ سوز یہ بات جانتا ہے کہ میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔

"اس میں کچھ دیر لگ سکتی ہے آج کل بہت مصروف ہوں۔ افسانوی مجموعہ چھاپنا چاہیں تو چند دنوں میں دے سکتا ہوں۔"

"آپ فوراً دے دیجئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ "کرماں والی" دیکھنے شام کو آ رہا ہوں۔"

تو ایک پبلشر ایسا بھی ہے جو سمال سکیل انڈسٹری کو بھی فروغ دینا چاہتا ہے اور افسانہ تو خیر آتا ہی اسی زمرے میں ہے۔ ناول تو دوسری کیٹگری کی چیز ہے۔

اگر چند دن پہلے نریندر ناتھ سوز سے "کرماں والی" کے حوالے سے ٹیلی فون پر بات نہ ہوتی، تو شاید اس سال بھی میرا کوئی افسانوی مجموعہ نہ چھپ سکتا۔ اگرچہ ناول تو تین چھپ جاتے جو ان دنوں پریس میں ہیں۔ گفتگو کی وہ ساعت واقعی بہت کرماں والی تھی۔ میں اس گفتگو کا اختتام "کرماں والی" کے آخری جملے سے ہی کرتا ہوں۔ کرماں والی اپنے خاوند فیضے کی قبر پر چراغ جلا کر دعا کرتی ہے۔

"میرے مولا! سب کو اپنے اپنے گھروں کی برکتیں نصیب ہوں۔"

یہ برکتیں اُردو زبان کے پرستاروں اور اس سے عشق کرنے والوں کو بھی نصیب ہوں. یہی میری تمنا ہے!

کشمیری لال ذاکر
۳۶۷، سیکٹر ۴۴ اے
چنڈی گڑھ

یہ شہر زندہ رہے گا

جنوری کا مہینہ چنڈی گڑھ میں کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دراصل اس شہر کا تو اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ تو ادھر اُدھر سے جٹورا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا موسم بھی اپنا نہیں ہے۔ یہاں کے موسم کو بھی شملہ کنٹرول کرتا ہے۔ شملہ میں برف باری ہو تو چنڈی گڑھ میں کم سے کم بارش تو ہو ہی جائے گی۔ وہاں اگر یخ بستہ ہواؤں کی یلغار ہو گی تو یہاں کی ہوا میں ہاتھ پاؤں کو اکڑا دینے والی ٹھنڈک تو ضرور ہو جائے گی۔ اس بار جنوری کے مہینے نے شملہ میں برف باری کے پچھلے پچاس برس کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ چھ چھ فٹ برف گری تھی بازاروں میں۔ کئی روز تک تو شہر میں نہ بجلی تھی نہ پانی تھا۔ جو ٹورسٹ لوگ شملہ میں برف کا نظارہ کرنے گئے تھے روتے ہوئے واپس آئے تھے۔ نتیجے کے طور پر چنڈی گڑھ میں بھی کڑاکے کی سردی پڑی تھی۔ بارش بھی کئی بار ہوئی تھی۔ ایک دن تو اولے بھی پڑے تھے۔ زندگی کا عام نظام بھی متاثر ہوا تھا۔
لیکن نظام صرف چنڈی گڑھ ہی کا متاثر نہیں ہوا تھا۔ جب سے عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا، دنیا بھر میں اس کا اثر پڑا تھا۔ سیکیورٹی کونسل کے حوالے سے دنیا کی کچھ بڑی طاقتیں مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن ایک عام آدمی کی زندگی جو کبھی بھی اندیشوں اور وسوسوں سے خالی نہیں ہوتی، اب کئی قسم کے اندیشوں میں گھر گئی تھی۔ مہنگائی اور چور بازاری کا ڈر تو تھا ہی۔ اس بات کا بھی خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ پٹرولیم پروڈکٹس کے ملنے میں بھی دشواری ہو جائے گی اور اگر کہیں جنگ چھڑ گئی تو بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ جوں جوں وہ تاریخ نزدیک آتی جا رہی تھی جس تاریخ تک عراق کو یہ الٹی میٹم دیا گیا تھا کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لے، لوگوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ الٹی میٹم کی تاریخ پندرہ جنوری تھی۔

یہ بارہ جنوری کی بات ہے۔

اپرنا آئی تھی۔

اپرنا میرے پڑوسی مہاجن صاحب کی بیٹی ہے جو کالج میں پڑھتی ہے اور جسے ناول پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار کوئی ناول لے جاتی ہے اور کچھ دیر بیٹھ کر گپ شپ بھی کرتی ہے۔ بہت انٹیلی جینٹ لڑکی ہے لیکن

آج وہ ناول لینے نہیں آئی تھی۔ ایک دوسرے ہی کام سے آئی تھی۔ کہنے لگی
"انکل، آپ کے پاس سائیکل ہے؟"
"ہے تو سہی۔ لیکن وہ گیرج میں پڑی ہے۔ میرے خیال سے تو اب تک اس کے ٹائر ٹیوب بھی ختم ہو چکے ہوں گے۔"
"تو آپ سائیکل استعمال نہیں کرتے؟"
"بہت زمانہ ہو گیا چھوڑے ہوئے۔ جب تک سکوٹر نہیں لیا تھا، سائیکل ہی چلاتا تھا۔ سکوٹر لے لیا تو سائیکل چھوٹ گئی۔"
"اور جب کار لے لی تو سکوٹر بھی چھوٹ گیا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے زور کا قہقہہ لگایا۔
"بس یہی ہوا۔"
"لیکن آپ کو تو معلوم ہے سائیکل چلانا تو بہت بڑھیا ایکسر سائز ہے۔"
"مجھے ایکسر سائز کا شوق نہیں۔"
"اسی لئے تو سائیکل بیکار پڑی ہے۔"
"ہاں۔ لیکن تمہیں سائیکل کی کیا ضرورت آپڑی؟"
"کل صبح ایک سائیکل ریلی ہو رہی ہے۔ سُکھنا لیک سے لیژر ویلی تک۔ سکولوں اور کالجوں کے سٹوڈینٹس کے علاوہ عام پبلک بھی ریلی میں حصہ لے رہی ہے۔"
"ریلی کیوں ہو رہی ہے؟"
"اگر کہیں گلف وار ہو گئی تو پیٹرول نہیں ملے گا۔ لوگوں میں سائیکل چلانے کی سینس پیدا کی جائے۔ ایک مقصد تو یہ ہے۔"
"اور دوسرا مقصد؟"
"سائکلنگ بہت اچھی ایکسر سائز ہے۔"
اپرنا نے گیرج سے خود ہی سائیکل نکالی۔ نوکر نے تو کبھی اُسے صاف بھی نہیں کیا تھا۔ بیچاری نے اُسے خود ہی صاف بھی کیا۔
"آپ نے تو انکل بیچاری کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ اب اسے مارکیٹ میں بھجوا کر اس کے انجر پنجر ٹھیک کرواتی ہوں۔"
اپرنا سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد مہاجن صاحب کا نوکر اُسے دھکیل دھکال کر لے گیا۔
شام کو جب اپرنا سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے ہمارے گھر آئی تو سائیکل ایکدم اورہال ہو رہی تھی۔
"یہ لیجئے بل۔"
سائیکل کی مرمت کا بل بھی اُس کی گھنٹی کی طرح خاصا سُریلا تھا۔
سائیکل کو گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے اپرنا نے کہا۔
"انکل صبح آٹھ بجے تک سُکھنا لیک پر آجائیے۔ وہیں سے ریلی شروع ہو گی۔"

"کیسے پہونچوں گا اتنی سویرے؟"

"کار سے آجایئے۔ پھر میں آپکو ریلی میں شامل کرا لوں گی۔ لیکن اپنی وہ ملٹی کلرڈ کیپ ضرور پہنیے اچھا بائے۔" اپرنا پیڈل پر پاؤں رکھ کر گیٹ سے باہر نکل گئی۔

میں نے ایک دن پہلے ہی کوئی گھنٹہ بھر قطار میں گاڑی لگا کر پٹرول پمپ سے پٹرول ڈلوا لیا تھا۔ اس لئے اگلی صبح سُکھنا لیک پر پہونچنے میں کوئی اڑچن نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ مجھے صبح جلدی تیار ہونا تھا۔ جس کی مجھے عادت نہ تھی۔ بہر حال بنا ناشتہ کئے میں کار سے سُکھنا لیک پہونچ گیا۔ جہاں میں نے گاڑی پارک کی وہاں پہلے سے ہی بہت سی گاڑیاں موجود تھیں۔ یعنی بہت لوگ مجھ سے بھی پہلے وہاں پہونچ چکے تھے۔ اور اِدھر اُدھر سڑک پر لڑکے لڑکیاں، بچے، عورتیں، مرد اور کئی بڑی عمر کے لوگ اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالے اور رنگ برنگی کپڑے پہنے، قطاروں میں کھڑے تھے اور جھنڈی لہرانے پر سائیکلیں گھمانے کو تیار تھے۔ اور پھر چنڈی گڑھ کے چیف کمشنر (جسے اب ایڈوائیزر کہتے ہیں) نے جھنڈی لہرائی اور کئی ہزار سائیکلیں ایک ساتھ سڑک پر گھوم گئیں۔

ایک ٹکڑی کی لیڈر اپرنا مہاجن تھی۔ جس کا پاؤں میرے گیرج میں بیکار پڑی اور بحال ہوئی سائیکل کے پیڈل پر تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "آپ یہیں رُکئے۔ میں ابھی واپس آرہی ہوں۔"

میں سڑک کے کنارے پر کھڑا اتنے بڑے ہجوم کو اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے کچھ ہی ماہ پہلے کا ایک دوسرا منظر گھوم گیا۔

منڈل کمیشن کی سفارشات کے خلاف ملک بھر میں پروٹسٹ ہو رہے تھے۔ کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اپنے آپ کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ یہاں چنڈی گڑھ میں بھی اس طرح کے دلدوز المیے ہوئے تھے۔ سٹوڈینٹس کے ہجوم کھلی سڑکوں پر نعرے لگاتے ہوئے گھومتے تھے۔ بازار بند تھے۔ ٹریفک ایک دم رک گئی تھی۔ سرکاری گاڑیاں جلائی جا رہی تھیں۔ دن کے اس ہنگامے کے بعد رات کو بچے اور بچیاں مشعلیں جلا کر مختلف سیکٹروں میں گھومتے تھے۔ تالیاں بجاتے تھے اور نعرے لگاتے تھے۔ ایسی ہی ایک رات کو اپنے سیکٹر کی سڑکوں پر جلتی ہوئی مشعلیں ہاتھوں میں لئے، بچوں کا جلوس میرے گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ میں گیٹ پر کھڑا تھا۔ جبھی جلوس کے آگے آگے نعرے لگاتی ہوئی اپرنا، جلوس سے الگ ہو کر میرے پاس آئی تھی۔

"یہیں رُکئے انکل۔ ساتھ لگتے سیکٹروں سے اور جلوس آنے والے ہیں۔ کل کے اخبار میں ضرور دار خبر دیجئے۔"

میں اس کی بات سُن کر مسکرا دیا تھا اور اپنے گیٹ پر کافی دیر کھڑا دوسرے سیکٹروں سے آتے ہوئے جلوسوں کو بھی دیکھتا رہا تھا۔

اس سے اگلے دن ہمارے سیکٹر کی ایک اسٹوڈینٹ نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی اور اس کا جسم پچاس فی صد جل گیا تھا۔ دو دن کے بعد اس نے اسپتال میں دم توڑ دیا تھا۔ اس شام اپرنا مجھے اس لڑکی کے والدین کے پاس انٹرویو کے لئے لے گئی تھی۔ میں نے اس انٹرویو کے حوالے سے اگلے روز اخبار میں اپنی سٹوری فائل

کی تھی۔ اس شام کو بھی اپرنا نے یہی کہا تھا۔

"بس یہیں رکیئے انکل۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اپرنا پھر نہیں آسکی تھی کیونکہ اچانک کرفیو لگ گیا تھا۔

اور یہ چند ماہ پہلے کی بات تھی۔

لیکن آج صبح مجھے رکنے کے لئے کہہ کر اپرنا تھوڑی دیر میں لوٹ آئی تھی۔ کچھ مہینے پہلے اس کے سامنے کوئی دوسرا مقصد تھا۔ آج وہ ایک الگ مقصد سے مجھے رکنے کیلئے کہہ کر گئی تھی۔ لیکن اصل بنیاد رائے عامہ کو متحرک کرنا تھا۔ عوام کی رائے جس بھی مسئلے پر مرکوز ہو جائے وہی مسئلہ اہم ترین ہو جاتا ہے۔ چند مہینے پہلے وہ مسئلہ منڈل کمیشن کی سفارشات تھیں۔ آج وہ مسئلہ عالمی امن کا تھا۔ پٹرول کی بچت جس کی صرف ایک شق تھی۔

اپرنا اپنی ٹولی کو لیڈر ریلی میں پہونچا کر شارٹ کٹوں سے دوبارہ سنکھا لیک پر آگئی تھی۔ جہاں اب صرف تماشہ بین قسم کے لوگ ہی رہ گئے تھے، جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ جنوری کی سرد صبح کے سمے بھی اپرنا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے یہ اس جذبے کے طمانت کے کارن تھے، جس نے اس کی تمام شخصیت کو اس وقت اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"آیئے انکل، بیٹھئے سائیکل کی کیریر پر۔ اس ملٹی کلرڈ کیپ میں آپ واقعی بڑے شاندار لگ رہے ہیں۔"

"سائیکل تم چلاؤ گی؟"

"ہاں انکل۔"

"میں چلاتا ہوں، تم کیریر پر بیٹھو۔"

"لیکن اب تو آپ سائیکل چلانا بھول چکے ہوں گے۔"

"نہیں سائکلنگ اور ڈرائیونگ بھولتی نہیں۔ بس ذرا پریکٹس چاہیئے۔"

"پریکٹس ریلی کے بعد کر لیجئے نا۔"

"پھر پٹرول تو ختم ہو چکا ہوگا۔"

"تو آپ ہیرو بننا چاہتے ہیں؟"

نہیں یہ میری بات کا اپرنا برا مان گئی تھی شاید۔

"سائیکل تو آپ ہی کی ہے۔ میرا کیا حق ہے اس پر۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"نہیں رکو ذرا۔"

"کیوں؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے کیمرے سے اس کی کئی تصویریں لے لیں۔

ریلی کی تصویریں تو پہلے ہی لے چکا تھا۔

"پیڈل گھماؤ۔ میں پیچھے بیٹھتا ہوں۔"
"انکل۔ یو آر گریٹ۔" پل بھر میں اس کا چہرہ کھل اٹھا۔
"ریلی کی ہیرو تو تم ہو۔ آئی ایم سوری۔"
اپرنا نے پیڈل گھمائے اور میں کیریر پر بیٹھ گیا۔ ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھ سکا تھا اس لئے لمحہ بھر کے لئے سائیکل دائیں بائیں جھول گئی۔ اپرنا کھلی سڑک پر پوری رفتار سے سائیکل چلائے جا رہی تھی اور ہانپ رہی تھی۔ ابھی ریلی کا کچھ حصّہ تو سڑکوں پر ہی تھا۔ لیڈر ویلی میں تو سارے سائیکلسٹ نہیں پہونچ پائے تھے۔ ابھی وہاں پہونچتے ہی اس نے سائیکل مجھے تھمادی اور خود اپنی دوستوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی۔
میں سائیکل کو تھامے ایک طرف کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میری کار تو تُخنا لیک پر ہی کھڑی تھی۔ اُسے بھی تو لینا ہوگا۔ میں سائیکل کو سڑک پر لانے ہی والا تھا کہ اپرنا میری طرف بھاگتی ہوئی آئی۔
"انکل ہیو لے ڈرنک۔"
میں نے اپرنا کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کی بوتل لے لی اور اُسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔
"کیا دیکھ رہے ہیں انکل ؟"
"میں اخبار کے لئے آج کی سٹوری کا ٹائیٹل دیکھ رہا ہوں۔"
اپرنا شرما گئی اور سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
"سائیکل چلائیے۔ میں پیچھے بیٹھتی ہوں۔ تُخنا لیک پر پارک کی ہوئی گاڑی بھی تو لینی ہے آپ کو۔"
اس نے میری ملٹی کلرڈ کیپ میرے سر سے اُتار کر اپنے سر پہ جمانے سے پہلے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک بار جھٹک دیا۔
اور میں نے سائیکل کے پیڈل گھمادیئے۔
مجھے لگا جیسے انسانی رشتوں کا شہر ایک بار پھر زندہ ہو گیا تھا۔
انسانی رشتوں کا شہر تو ہمیشہ ہی زندہ رہتا ہے۔

آؤ ہم دوست بن جائیں

بینٹ ونگ کے ہوٹل پانگے گر کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے اُسے چار سال پہلے کی بات یاد آگئی۔

وہ دارالاسلام کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور اسے اپنے سفر کے بارے میں کچھ ضروری نوٹس لینے تھے تاکہ بعد میں وہ افریقی ملکوں کی وزٹ کے بارے میں ایک سفرنامہ لکھ سکے۔ سفرنامے لکھنے اُسے پسند تھے۔ اس لئے کہ وہ یادوں کی حسین دستاویزیں بن جاتی ہیں۔ ہوٹل سے متعلق جو ضروری انفارمیشن اسے اپنے کمرے کی چابی لیتے وقت ملی تھی اس کے مطابق ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو مقابلتاً تھوڑے معاوضے پر اسٹینو کی سہولت بھی مل سکتی تھی۔ اس کے پاس وقت کم تھا۔ اس لئے وہ خود زیادہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ہوٹل کے ریسپشن سے کہا کہ وہ اُس کے لئے کسی اسٹینو کا انتظام کر دے وہ ابھی کاغذ کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر لکھے نوٹس کو ڈکٹیشن دینے کے لئے ارینج کر ہی رہا تھا۔ کہ کمرے کی گھنٹی بجی۔

"پلیز کم اِن۔" اُس نے کہا۔

اور لمحہ بھر میں ایک قبول صورت لڑکی اپنے ہاتھ میں نوٹ بک لئے اندر آگئی۔

"مارننگ سر"

"مارننگ، پلیز سِٹ"

وہ لڑکی بیٹھ گئی۔

"ڈُو یُو بی لانگ ٹُو تنزانیا؟"

"یس سر"

"یور نیم"؟

"مارگریٹ"

اِس مختصر سی ابتدائی گفتگو کے بعد گوزیمن نے اسے اپنے سفر کے نوٹس لکھوانے شروع کر دئے۔ ابتدا

میں مارگیریٹ کو ڈکٹیشن لینے میں دِقت ہوئی۔ کچھ اس کے بولنے کا لہجہ کچھ ڈکٹیشن دینے کی رفتار اور کچھ نئے الفاظ جو عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد دونوں نے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا اور مارگیریٹ بڑے انہماک سے نوٹس لینے لگی۔

کوئی آدھ گھنٹہ ڈکٹیشن دینے کے بعد گورنجن نے چائے منگوائی

"میرے لئے دُودھ اور شکر نہیں" مارگیریٹ بولی

"آپ تو اچھی خاصی ہندوستانی بول لیتی ہیں"

"ہم جس ایریا میں رہتے ہیں، وہ خالص ہندوستانی آبادی والا علاقہ ہے۔ اِس لئے ہندوستانی بولنا سیکھ گئی ہوں"

"آپ کے پیرینٹس؟"

"وہ موانزا میں رہتے ہیں۔ یہاں سے کوئی دو سو کلومیٹر دُور۔ میرے فادر ہندوستانی ہیں اور مدر افریقی"

"یہ کیسے؟"

"میرے دادا بزنس کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ پھر ہندوستان واپس نہیں گئے۔ یہیں بس گئے"

"تو آپ کے خاندان کی جڑیں ہندوستان کی دھرتی میں ہیں"

"اور ہمیں اِس پر فخر ہے۔" وہ زور سے ہنسی اور پھر اُس نے چائے کی خالی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر الگ میز پر رکھ دیں۔ جب ڈکٹیشن کا کام ختم ہو گیا تو مارگیریٹ نے کہا۔

"اگر آپ کہیں گھومنا پھرنا چاہیں تو میں شام کو اوف ہوں۔ آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں"

"اس کے لئے شکریہ۔ میں تو دارالاسلام میں کسی کو نہیں جانتا"

"تو آپ چار بجے لاؤنج میں آجایئے۔ میں وہیں ملوں گی"

شام کو چار بجے جب گورنجن تیار ہو کر نیچے آیا تو مارگیریٹ کی خلوص بھری مسکراہٹ اس کا استقبال کر رہی تھی۔

"آپ کچھ شاپنگ کرنا چاہیں گے؟"

"تھوڑی بہت شاپنگ تو کرنی ہی پڑے گی"

"دُکانیں تو اب پانچ بجے کھلیں گی۔ ایک سے پانچ بجے تک مارکیٹ بند رہتی ہے"

"یہاں لوگ واقعی لائف کو اینجوائے کرتے ہیں"

"جی ہاں" مارگیریٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ہم تب تک کیا کریں گے؟"

"دو اڑھائی گھنٹے میں آپ کو یہاں کی کچھ جگہیں دِکھا دیتی ہوں۔ خاص طور سے بیچ۔ سمندر کا ساحل"

ٹھیک ہے۔"

گوربچن اور مارگیریٹ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مارگیریٹ اُسے شہر کے مختلف حصّے دکھاتے ہوئے آخر سمندر کے ساحل پر لے گئی۔ مختلف جگہوں سے آئے لوگوں کا ٹھٹھ لگا تھا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی سفید ریت پر وہ مارگیریٹ کے پہلو میں کھڑا اُفق تک پھیلے سمندر کو دیکھتا رہا۔ جس کی لہروں میں دُور دُور تک مچھیرے اپنی کشتیاں لئے مچھلیوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جو سات دن گوربچن نے دار السلام میں گزارے ان میں سے آخری چار دن وہ مارگیریٹ کے ساتھ ہی رہا۔ وہ اس کے لئے نوٹس بھی ٹائپ کرتی رہی۔ اُسے گھماتی بھی رہی۔ شاپنگ بھی کراتی رہی اور سُہالی زبان بھی سکھاتی رہی۔ ان آخری چار دنوں میں گوربچن نے جانا کہ پچھڑے ہوئے لیکن آزادی اور ترقی کی جدّوجہد میں مصروف ملکوں کی داستان لگ بھگ ایک ہی جیسی ہے دنیا کا عام آدمی چاہے وہ افریقی ہو، چاہے تھائی ہو، چاہے ہندوستانی ہو، بُنیادی طور پر امن پسند اور شریف ہے اور انسان کے لئے ایک حسین مستقبل پر یقین رکھتا ہے۔

جس دن گوربچن کو دار السلام سے جانا تھا مارگیریٹ تمام دن اس کے ساتھ رہی اور اسے ایرپورٹ تک چھوڑنے بھی آئی اور جب ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے گوربچن نے اس سے ہاتھ ملایا تو اُس کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔

"میرے وطن کو میرا اسلام کہیئے گوربچن صاحب" یہ کہتے ہوئے مارگیریٹ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ یوڈی کلون کی خوشبو میں بسے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکراکر بولی۔

"سلام رفیقی؟"

"سلام" گوربچن نے جواب دیا اور پھر اپنا بورڈنگ کارڈ چیک کرواتے ہوئے ہوائی جہاز کی طرف بڑھ گیا۔

اور اس وقت گوربچن بینڈونگ کے ہوٹل پلانگے گرے کے لاؤنج میں بیٹھا پرمادی کا انتظار کر رہا تھا۔ پرمادی اُسے دو دن پہلے جکارتا میں ملی تھی جہاں وہ ایک بُک شاپ میں انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں سے متعلق کوئی کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ سیلزگرل اُسکی بات نہیں سمجھ پارہی تھی۔ اس نے گوربچن کے سامنے انڈونیشیا سے متعلق یوں تو ڈھیر ساری کتابیں جمع کر دی تھیں لیکن جو کتاب اُسے چاہیئے تھی، وہی نہیں مل رہی تھی۔ جب وہ سیلزگرل کو اپنی بات ٹھیک سے نہ سمجھا پانے کی کوفت میں کُڑھ رہا تھا، ٹھیک اُسی لحہ پرمادی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور مسکراکر بولی۔

"مے آئی ہیلپ یو؟"

"پلیز"

گوربچن کی بات سمجھنے میں اُسے ذرا بھی دیر نہ لگی اور جب اُس نے بھاسا انڈونیشیا میں سیلزگرل کو سمجھایا

تو وہ مسکرا کر بولی۔

"او ہو سوری سر"

پھر وہ جھٹ سے انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں پر دو تین کتابیں لے آئی لیکن وہ سب بھاسا انڈونیشیا میں تھیں۔ کتابوں کو دیکھ کر گورہین دھیرے سے مسکرایا اور پھر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ پرمادی اس کی الجھن جان گئی۔ اس نے سیلز گرل سے دوبارہ بات کی اور خود بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ سیلز گرل کے ساتھ ہی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں سے متعلق انگریزی میں ایک کتاب تھی۔ اگر پرمادی گورہین سے نہ ملتی تو اسے انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں کی کوئی کتاب شاید ہی مل پاتی۔ وہ اپنے من میں کڑھتے ہوئے واپس اپنے ہوٹل چلا جاتا اور بنا شکر اور دودھ کے کڑوی کافی پیتا رہتا۔ کتابیں خرید چکنے کے بعد گورہین دیر تک پرمادی کے ساتھ بات چیت کرتا رہا اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ایک شاعرہ بھی تھی اور سونڈانی زبان میں شاعری کرتی تھی، جو زبان مغربی جاوا کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اس کے خاوند ڈاکٹر تھا اور ان کے دو بچے تھے۔ بک شاپ سے نکلنے کے بعد پرمادی گورہین کو اپنی کار میں بٹھا کر قریب کے ایک ریستوراں میں لے گئی۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر پرمادی اسے انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے بارے میں تفصیل سے بتاتی رہی۔ اگلے روز وہ گورہین کو موناز کے زمین دوز وسیع ہال میں بھی لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں تصویروں کے ذریعے انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی تمام داستان بیان کی گئی تھی۔

وہیں ریستوراں میں بیٹھے پرمادی نے اسے اپنی ایک نظم بھی سنائی ؎

سمندر کی لہروں کی طرح
تم میرے قریب آتے ہو
چند لمحے ساحل کی خشک ریت پر
اپنی ٹھنڈک کا احساس دلاتے ہو
اور پھر اچانک، بنا میری آنکھوں میں جھانکے لوٹ جاتے ہو
تم شاید نہیں جانتے کہ ساحل کی خشک ریت مضبوط چٹان پر کھڑی ہو کر
دن رات سمندر کی لہروں کا انتظار کرتی ہے۔

گورہین نظم کے مرکزی خیال سے بے حد متاثر ہوا۔ دل کی دھڑکنوں کی زبان ایک ہی ہے۔ یہ زبان ہر کوئی سمجھ سکتا ہے، چاہے وہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ہو۔ اسے سمجھنے کے لئے کسی انٹرپریٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے اپنا ہاتھ پرمادی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مسکرا کر بولا۔

"تریما کاسی۔ (بے حد شکریہ)"

"تریما کاسی" بڑی احسان مند نگاہوں کی مدد سے اس نے کہا تھا۔

اس لمحے بینڈونگ کے ایک ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا گورنچن اپنی دوست پرمادی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جکارتا سے اسی ٹرین سے آنے والی تھی جس ٹرین سے کل وہ خود آیا تھا۔ اُسی کے کہنے پر تو وہ ٹرین سے آیا تھا ورنہ ٹیکسی سے آتا۔ ٹرین کے سفر کا اُسے ویسا ہی لُطف آیا تھا جیسا کہ پرمادی نے اُسے کہا تھا۔
اڑھائی بج رہے تھے۔ وہ آنے ہی والی ہوگی۔ اور اُس نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے پرمادی کھڑی تھی۔
"سلامت داتنگ (خوش آمدید)"
"تریما کاسی۔"
وہ اس سے ہاتھ ملا کر اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر سے آنے کے لئے معذرت چاہتی رہی۔ پھر وہ دونوں ریستوراں میں چلے گئے۔ گورنچن نے کھانا نہیں کھایا تھا کیوں کہ وہ اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر پرمادی اُسے بینڈونگ میں گھمانے لے گئی۔
اُس نے گورنچن کو وہ عمارت بھی دکھائی جہاں لگ بھگ تیس برس پہلے ایشیائی کانفرنس ہوئی تھی اور پنچ شیل کے اصولوں پر عالمی امن کی بُنیاد رکھی گئی تھی۔ وہ دونوں دیر تک اس عمارت کے احاطے کے اندر خاموش کھڑے رہے۔ پھر پرمادی نے قریب کے ایک پودے سے ایک پھول توڑ کر گورنچن کے کوٹ کے بٹن ہول میں لگا دیا۔
"تریما کاسی" گورنچن نے کہا۔
اور پرمادی جواب میں مسکرا دی۔ پرمادی اُسے گئی رات تک گھماتی رہی۔ پھر وہ اُسے اپنے گھر لے گئی جہاں وہ اُس کی شفیق بوڑھی ماں سے مِلا جو اُسے دیر تک دُعائیں دیتی رہی۔ اور پھر پرمادی اُسے سڑک تک چھوڑنے آئی اور جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو بولی۔
"مان گا (خدا حافظ)"
جب وہ ہوٹل پہونچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھا وہ سوچتا رہا کہ مائیں چاہے دنیا کے کسی بھی حصے سے تعلق رکھتی ہوں اپنے بچوں سے ایک ہی جیسا پیار کرتی ہیں۔ بے غرض اٹوٹ اور بے پناہ!

دھلی کے تین مورتی مارگ پر بنگلے میں کھڑی تین مورتیاں ایک دم خاموش ہیں. خاموش، بے جان اور ساکت۔ ان کے سامنے لوہے کا بڑا سا گیٹ بند ہے۔ گیٹ کے باہر بے شمار لوگ آہنی سلاخوں کو پکڑے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔ گیٹ کے اندر کے وشال بھون میں ایک دردناک فضا ہے۔ اس عمارت کی دیواروں کو ناز اور شان بخشنے والا انسان ان سے وداع ہو گیا ہے۔ کروڑوں انسانوں کی دھڑکنوں میں سمایا ہوا شخص انھیں ایکدم چھوڑ گیا ہے جس نے ایک بار ان لوگوں کے لئے کہا تھا کہ :

" If any people choose to think of me then I should like them to say; This was the man who, with all his mind and heart, loved India and the Indian people. And they in turn, were indulgent to him and gave him of their love most abundantly and extravagantly."

وہی اس گھڑی ان سب سے بے نیاز گہری نیند سو یا پڑا ہے اور اس کے پاس اس کی اکلوتی لڑکی جسے وہ پیار سے اندو کہا کرتا تھا اور جس کے خط درست کر کے واپس بھیجا کرتا تھا غم و الم کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ روح میں اچانک بھڑکی آگ نے آنسوؤں کے سوتے خشک کر دیئے ہیں۔

شام ہو رہی ہے، لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔

سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

سب کے ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔

اور سب کے من میں یہ تمنا ہے کہ وہ ایک بار اور آخری بار اس چہرے کے درشن کر لیں جسے دیکھنے کو پھر آنکھیں ترس جائیں گی۔

اور پھر لوہے کا بڑا سا گیٹ دھیرے دھیرے کھلتا ہے

انسانوں کا ایک دریا بڑھتا ہے عمارت کے اندر، باندھ توڑ کر اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی شردھا کی نہریں سب چیزوں کو اپنے میں سمولیتی ہیں چاروں طرف ایک اتھاہ سمندر پھیل جاتا ہے اور اس سمندر میں خشکی کا ایک سفید سا ٹکڑا نظر آرہا ہے، جیسے ایک غیر آباد جزیرہ ہو اور اس جزیرے میں صرف خاموشی اور سکوت ہے کہیں زندگی کی رمق نہیں صرف ایک گھلتی ہوئی سی شمع جل رہی ہے۔ ہلکی ہلکی روشنی بکھرتی ہوئی۔ اور یہ روشنی اس سرخ پھول کی پنکھڑیوں میں سے پھوٹ کر نکل رہی ہے جو اس شخص کی اچکن میں اٹکا ہے۔ رات کا اندھیرا بڑھ رہا ہے لیکن اس چراغ کی روشنی بڑی خاموشی اور عزم سے سب کے درمیان جل رہی ہے اور اس اجالے میں آنکھوں کے آنسو، ہونٹوں کی سسکیاں سینوں کی دھڑکن اور روح کی جلن نظر آرہی ہے۔

اور یہ سب کچھ نظر آرہا ہے صرف دو ہستیوں کو۔

ایک سفید ساڑھی میں برف بنی اندرا کو

اور ایک لان کے کونے میں اُگے گلاب کے پودے پر ادھ کھلے پھول کو اور وہ پھول میں ہوں اور اس گھڑی اپنی ہی روشنی سے سب کو دیکھ رہا ہوں۔ سب کے درد کو محسوس کر رہا ہوں سب کی محرومی کے احساس کو ماپ رہا ہوں اور اپنی پنکھڑیوں کی آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہوں۔ اور رو رہا ہوں بغیر آواز کے اور اپنی بے زبان آواز میں مخاطب ہو رہا ہوں ان سب سے جو یہاں جمع ہیں۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس کی کوئی گونج نہیں جس کے کوئی الفاظ نہیں کوئی ارتھ نہیں پھر بھی اس کے معنیٰ ہیں، ایک مقصد ہے، ایک منزل ہے۔

گلاب کا یہ پودا بہت دنوں سے یہاں کھڑا ہے۔ اس نے درجنوں پھول کھلائے ہیں۔ اور آج شاید میں آخری پھول ہوں جو اس کی ٹہنی پر کھلا ہوں، پھر اس ٹہنی پر کوئی پھول نہ کھلے گا، کوئی کلی نہ چٹکے گی، کوئی خوشبو نہ اڑے گی کوئی رنگ نہ نکھرے گا۔

میرے ساتھ تین پھول اور بھی ہیں، ہم سب صبح شام کے وقفے سے کھلے ہیں۔ ہماری شکل وصورت، سج دھج، روپ رنگ بالکل ایک جیسا ہے۔ ہمیں مالی نے بڑے پیار اور دُلار سے پالا ہے۔ ٹہنیوں کی تراش خراش کی ہے پانی دیا ہے، سوکھے پتوں کو الگ کیا ہے۔ نئی نئی کونپلوں کو اپنی محبت کی حرارت دی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم میں سے ایک پھول الگ ہو گیا ہے۔ مالی جب توڑنے آیا تو ہم سب نے اپنی اپنی گردنیں ہلا کر خود کو پیش کیا لیکن اس نے صرف ایک پھول کو توڑا جو سب سے آخر میں کھلا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا مالی اس پھول کو مالک کی اچکن میں ٹانگ رہا تھا کیونکہ آج ابھی تک ان کی اچکن میں پھول نہیں لگا تھا کہیں ایک کمی رہ گئی تھی، جسے کسی نے اب تک محسوس نہ کیا تھا۔ اور اب وہ کمی پوری ہو گئی تھی اور یہ وہی پھول تھا جس کی روشنی ارد گرد چھائے اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھی۔

اور پھر اندھیرا چھٹ گیا لیکن انسانوں کی شردھا کا ٹھاٹیں مارتا سمندر اور بھی گہرا ہوتا گیا اور اس وسیع

سمندر میں نظر آتا خشکی کا ٹکڑا اور بھی اونچا ہو گیا۔ طوفان بھی اُٹھا تھا، بادل بھی کڑکے تھے، مینہ بھی برسا تھا لیکن غم کی شدت ایک مقام پر رُک گئی تھی۔ ماحول ساکن ہو گیا تھا مشرق کے جھروکے سے سورج نکلا تھا اُس کی کرنوں نے عمارت کے در و دیوار کے ساتھ لگ کر سسکیاں بھری تھیں اور اس ہستی کو گھر کے ایک ایک کونے میں تلاش کیا تھا جو ان کرنوں کو اُٹھا کر ایک مشعل بنا رہا تھا جس کی روشنی میں وہ دنیا کے ہر فرد و بشر کو امن، محبت اور بھائی چارے کا راستہ دکھا رہا تھا۔

گیتا، قرآن، جپ جی صاحب کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ رُندھے ہوئے گلے سے رام دھن کا اُچارن ہو رہا تھا اور اپنے مالک کو گھر سے سدا کے لئے وداع کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں سبز سبز پتوں کی اوٹ سے گردن اُٹھا اُٹھا کر سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان کلیوں کو بتا رہا تھا جو کانٹوں کے ساتھ لگی سسک رہی تھیں اور لہولہان ہو رہی تھیں۔

اور پھر آسمان کو دہلا دینے والی ایک ہوک اُٹھی اور گھر کا مالک گھر سے جدا ہو گیا۔ ایسا مالک جس کا گھر صرف اس تین مورتی مارگ کی عمارت کی دیواروں پر مشتمل نہیں تھا۔ اس کا گھر تو ہمالیہ کی چوٹیاں تھیں، سندھ مہا ساگر کی ترنگیں تھیں، اجنتا اور ایلورا کے غار تھے۔ گنگا اور جمنا کی لہریں تھیں لال قلعہ اور جامع مسجد کی سُرخی تھی، غالب اور ہمایوں کے خواب تھے ظفر اور شیوا جی کے خاکے تھے، گوتم بدھ کے اصول تھے چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، گیہوں کی بالیاں اور دھان کے خوشے تھے۔ ترنجنوں کے گیت اور لوک ناچوں کی آن تھی۔ اور آج جب اتنے بڑے گھر کا مالک گھر سے جُدا ہو رہا تھا تو سبھی رو رہے تھے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں، ہند مہا ساگر کی لہریں رو رہی تھیں گوتم اور نانک کے اقوال سسک رہے تھے، اجنتا اور ایلورا کے بُت آنسو بہا رہے تھے کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں کانپ رہی تھیں اور ترنجنوں کے گیت اور لوک ناچوں کی آن تڑپ رہی تھی۔

میں یہ سب دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ میری طرح میری بہن بھی خاموش تھی جس کو لوگ اِندرا پریہ درشنی کہہ کر پکارتے تھے اور آج جس کے چہرے پر زمانہ بھر کی مایوسی پھیل گئی تھی۔

اور اس کے الفاظ "پاپُو الوداع"!

فضا میں گونج رہے تھے اور سرخ سرخ شعلے لپک رہے تھے اور چاروں طرف آنسوؤں کا سمندر پھیلا تھا اور کچھ ہی سو گز کے فاصلے پر بدھا اور عیسیٰ کا ثانی جسے کچھ برس پہلے گروسی فائر کر دیا گیا تھا اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میرا ہندوستان نہرو کے ہاتھ میں محفوظ رہے گا"!

میں نے یہ سب کچھ سنا ہے۔ میں اس کا ساکھشی ہوں اور میرے ساتھ ہزاروں میرے ساتھیوں نے بھی اُسے سُنا ہے میرے وہ ساتھی جو جانے کہاں کہاں کھلے تھے اور اب پنڈت نہرو کے قدم چومنے کے لئے سینکڑوں میلوں کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہونچے تھے۔ وہ سب اس دعوے کے ساکھشی ہیں۔

جب اِندرا واپس لوٹی تو وہ وشال بھون ایک کھنڈر بن چکا تھا جس میں یادوں کے چراغ جل رہے

تھے اور خوابوں کے پھول مرجھا رہے تھے۔

ایک دن اور بیت گیا۔

ایک یگ ختم ہو گیا

ایک زمانہ سو گیا۔

اور پھر پوپھٹی اور لال قلعے پر جھکا ہوا جھنڈا سرنہوڑائے اپنی یادداشت میں پچھلے سینکڑوں سال کی تاریخ کو دہرا رہا تھا۔

وسیع عمارت کی اداسی اور غمی کی چادر اوڑھے اس گھر کا پرانا ملازم ہیرالال . . . . آرہا تھا میری طرف۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کی اُداس آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں اس کے قدم میری طرف بڑھتے آرہے تھے۔ وہ بالکل میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ اُس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ رو پڑا۔ شبنم کے چند قطرے میری پنکھڑیوں سے ٹکرا کر پتوں پر جم گئے۔ یہ پنکھڑیاں ہی تو میری پلکیں ہیں رات جب روتی ہے تو اس کے آنسو ان پلکوں پر ہی تو جمتے ہیں۔ میں نے کئی بار رات کو روتے دیکھا ہے۔ رات جب ہی روتی ہے جب کسی سہاگن کا سیندور لٹتا ہے۔ وہ اس لمحے بھی روتی ہے۔ جب کوئی بچہ یتیم ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جب بھی آنسو آتے ہیں جب فٹ پاتھ پر سویا ہوا کوئی بھکاری سردی سے اکڑ کر مر جاتا ہے۔ وہ اس وقت بھی سسک اٹھتی ہے۔ جب کوئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر جھول جاتا ہے۔ رات آج بھی جی بھر کر روتی تھی۔ اس لئے کہ آج سبھی کچھ ہوا تھا۔ سہاگنوں کا سیندور بھی لٹا تھا۔ یتیمی کا وار بھی ہوا تھا۔ فٹ پاتھوں پر جاڑے سے بھی موتیں ہوئی تھیں۔ بے گناہ بھی پھانسی پر لٹکے تھے۔ رات کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی تھی اور اس کے ہونٹوں پر سسکیوں کی جلن تڑپ رہی تھی۔

میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ہیرالال کی سُوجی ہوئی آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

اور جب ہیرالال نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرے ساتھ کھِلے ہوئے دوسرے پھول کو توڑ کر اُسے اپنے غم کی چادر میں چھپا لیا تو میری روح میں سینکڑوں کانٹوں کی نوکیں ٹوٹ کر رہ گئیں۔

اور میں نے سنا اس دلدوز آواز کو جو شانتی گھاٹ کی گرم راکھ سے اُبھری تھی، جب اُس پر دودھ اور پانی چھڑکا گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں کوئی اُبلتا ہوا سیسہ ڈال رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ گھر کا مالک راکھ کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ کل شام لپکتے ہوئے شعلے گرم راکھ میں بدل گئے تھے۔ میں اب سُن تو نہیں رہا تھا، میرے کانوں میں چیخوں کی آواز نہ آرہی تھی۔ ہونٹوں پر لرزتی ہوئی سسکیاں مجھ تک نہ پہنچ رہی تھیں لیکن میری آنکھوں میں جو تیس جل اُٹھی تھیں روشنی اور تیز ہو گئی تھی، جیسے کل کے لپکتے ہوئے شعلے میری آنکھوں میں سما گئے تھے۔ میں نے دیکھا ایک دم حیرت زدہ اور بنا پلک جھپکائے۔ میں نے دیکھا کہ ہیرالال سر جھکائے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ٹھنڈی ہو چکی راکھ کے ڈھیر کے پاس آیا۔ پل بھر کو رُکا اس کے

ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لوٹی اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے غم کی چادر میں چھپایا گلاب کا وہ پھول، جو صبح اس نے توڑا تھا نکال کر راکھ کے ڈھیر پر رکھ دیا۔

"میرے مالک یہ اپنا من چاہا پھول سویکار کیجئے۔"

پاس کھڑے لوگوں کی چھاتی پھٹ گئی۔

وہ دھیرے دھیرے لوٹ گیا۔

سُرخ پھول ٹہنی پر کھلا ہوا دوسرا گلاب سرد راکھ کے ڈھیر پر پڑا رو رہا تھا لیکن اس کی سسکیاں منتروں کے اُچارن میں ڈوب گئی تھیں۔

اور پھر راکھ بھرا کلش تین مورتی مارگ کے وشال بھون کی آخری امانت بن کر شردھا اور عقیدت کا خراج وصول کرتا رہا جسے مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں آنسوؤں کی شکل میں پیش کرتی رہیں۔

میں یہ سب دیکھتا رہا اور کانٹوں سے لہولہان ہوتی کلیاں سرگوشیوں میں مجھ سے درد کی داستان سنتی رہیں۔

ایک یُگ اور بیت گیا۔

کروڑوں لمحوں کا ایک عظیم قافلہ ماتمی چال سے وقت کی راہوں پر سے گذر گیا۔

منزل کی تلاش تھی اندھیرے میں۔

اندھیرے میں بھلا منزلیں کہاں ملتی ہیں؟

اس گہرے اندھیرے میں کئی قافلے چلتے چلتے ایکدم رُک گئے تھے۔ کئی راستے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔ کئی منزلیں اپنا نشان گنوا رہی تھیں۔ اسی اندھیرے میں اپنے ساتھ کلیوں کو چمٹائے میں سوچ رہا تھا کہ ہم سب اب کہاں جائیں گے۔ ہماری منزلیں ہمیں اپنائیں گی کہ نہیں۔ عمارت کے وسیع احاطے میں اُگا ہر پیڑ، ہر بوٹا، ہر بیل، ہر پھول، ہر کلی یہی سوچ رہی تھی۔

اب ہم کہاں جائیں گے؟

اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

اب ہمارے سامنے کونسا راستہ ہے؟

ہماری سوچوں سے رات کا اندھیرا بوجھل ہو کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ سناٹا اور بھی شدید ہو گیا تھا۔

اندھیرے کی اس خاموشی میں ایک دھڑکن جاگی۔ ایک آواز گونجی۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ آواز میں کئی بار پہلے بھی سُن چکا تھا۔ اسی فضا میں، اسی ماحول میں، اسی عمارت کے اندر یہ پنڈت نہرو کی بہن کی آواز تھی، وجے لکشمی پنڈت کی اس عورت کی جس کے چہرے کو میں ایک ٹک دیکھتا رہتا تھا۔ کتنی جاذبیت اور جلال تھا اس چہرے پر اور وہی چہرہ کیسے بجھ گیا تھا۔ جیسے جلتی ہوئی مشعل پر کسی نے ایک دم پردہ ڈال دیا ہو

میرے اور ہم سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

وجے لکشمی پنڈت کی آواز دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی۔ وہ اپنے عزیز بھائی کی وصیت سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سُنا رہی تھیں۔ ان کی آواز میں درد تھا اور گلا رُندھ رہا تھا۔

"گنگا ندی کا تصور میرے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ بھارت کے ماضی کی علامت ہے جو زمانہ حال میں سے گذرتی ہوئی مستقبل کے مہاساگر کی طرف بہہ رہی ہے۔ اگرچہ میں نے ماضی کی بہت سی روایات و رسوم کو ترک کر دیا ہے اور میری زبردست خواہش ہے کہ بھارت کو ان تمام بندھنوں سے نجات حاصل ہو جو اس ملک کے بہت سے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، ان کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور ان میں نفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں، تاہم میں ماضی سے اپنا رشتہ بالکل ہی نہیں توڑ لینا چاہتا۔ مجھے اپنے عظیم ورثے پر فخر ہے اور مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں بھی بھارت کے دوسرے لوگوں کی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا ایک سرا بھارت کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچتا ہے..... بھارت کے ثقافتی ورثے کے تئیں آخری عقیدت کے طور پر میں یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری مٹھی بھر استھیاں الہ آباد کے مقام پر گنگا ندی میں بہادی جائیں تاکہ وہ اس مہاساگر میں مل جائیں جو بھارت کے ساحل کو چھو رہا ہے...... میری استھیوں کا بیشتر حصہ ہوائی جہاز کے ذریعے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں بھارت کے کسان محنت و مشقت کرتے ہیں تاکہ وہ بھارت کی مٹی میں مل کر بھارت ہی کا ایک حصہ بن جائیں......."

ہائے دھرتی سے کتنا پیار تھا اس کو جو ہم دھرتی پر رہنے والوں کو ایک دم تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر آسمان کی وسعتوں کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ اسے پہاڑ اور دریا پسند تھے۔ اسے گنگا سے اس لئے محبت تھی کہ وہ اسے روشن ماضی کی روایات کی امانت دار نظر آتی تھی اس میں حال کے حسین خاکوں کے رنگ اور مستقبل کے سنہری خوابوں کی رُوپ ریکھا تھی، اس کی لہروں میں ماضی، حال، مستقبل کا یہ تسلسل کتنا عزیز تھا پنڈت جی کو۔ اس لئے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کی راکھ کی ایک مٹھی گنگا میں بہادی جائے تاکہ وہ ایک عظیم مستقبل میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

اور پھر ایک صبح کشتی میں راکھ کا کلس لہروں پر سے گذرتا ہوا اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں گنگا جمنا ملتی ہیں اور جہاں سرسوتی ان میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ سرسوتی جو نظر نہیں آتی، جو گپت ہے۔ جو ان دو ندیوں کے نیچے بہتی ہوئی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن جس کی مہانتا کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ اور آج سنگم پر ایک اور دریا مچل رہا تھا، ایک بہت بڑی شخصیت کا دریا، جس کی ہلکی سی لہر بن تینوں ندیوں کی لہروں کو

اپنے بازؤں میں لے کر انھیں امر کر رہی تھیں۔ ایک ایسا دریا جو دیکھنے میں صرف راکھ کی ایک لکیر اور بے شمار پنکھڑیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی لیکن جس میں کروڑوں ہندوستانیوں کی بھاؤنائیں ملی تھیں لاکھوں سوچنے والوں کے دماغوں کی روشنی تھی، سینکڑوں مشعل برداروں کا اُجالا تھا اور اس میں وہ سہن شیلتا تھی جسے ہماری پرمپراؤں نے جنم دیا تھا۔ اس میں وہ ٹھہراؤ تھا جو ہماری تہذیب کا امانت دار تھا۔ اس میں وہ زور تھا جو ہمارے ارادوں کی دین تھا اور یہ چوتھا دریا اپنے آغوش میں تینوں ندیوں کو لئے بڑھے جا رہا تھا۔ ہند مہاساگر کی طرف انھیں بھی سمندر میں بدل ڈالنے کے لئے۔

اور چاروں دریاؤں کی ایک لہر پر ڈولتا ہوا میری ٹہنی پر میرے ساتھ کھلا ہوا تیسرا پھول تھا جسے سنجے اور راجیو توڑ کر لے گئے اپنے معصوم ہاتھوں سے آخری بھینٹ پیش کرنے۔ اور وہ پھول اپنی بھیگی ہوئی پنکھڑیاں لئے سورج کی کرنوں میں چمکتا ہوا بہے جا رہا تھا اور اسے میری یاد آ رہی تھی۔ میری یاد جسے وہ اکیلا چھوڑ گیا تھا اس اداس اور غمگین فضا میں سسکنے کے لئے۔

اور پھر اس سارے المیہ کی آخری کڑی تشکیل پا رہی تھی۔

اتنے بڑے گرنتھ کا انتم ادھیائے لکھا جانے والا تھا۔

ڈوبتے ہوئے سورج کا آخری روشن کنارہ افق کی وسعتوں میں ڈوبنے جا رہا تھا۔ وصیت میں لکھی آخری خواہش کی تکمیل ہونے والی تھی۔

پنڈت نہرو کی راکھ ان کھیتوں میں بکھری جانے والی تھی جہاں ہندوستان کے کسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اس لئے کہ راکھ کے وہ ذرے بھارت کی دھرتی میں سما کر ایک ہو جائیں۔

ہوائی جہاز راکھ لئے اُڑ رہے تھے پہاڑوں اور میدانوں پر گلیشیروں اور سوکھی چٹانوں پر جنگلوں اور سمندروں کو چھوتے ساحلوں پر قلعہ احمد نگر کے گرد پھیلے کھیتوں پر بکھر رہے تھے راکھ کے ذرے اسی کی دیواروں میں پنڈت جی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنی دھرتی کو آزاد کرانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کے خواب دیکھے تھے یہ راکھ جیسے اس تصویر کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ انڈمان اور لکشا دیپ، نجیم اور راج کوٹ کنیا کماری اور ٹری وینڈرم، بھونیشور اور امپھال، ملک کے چاروں کھونٹ ان کی راکھ کے ذرے بکھیر دیئے تھے کہ ان کے خواب دھرتی میں مل کر اس کا ایک جزو بن جائیں۔

میرے کانوں میں ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی اور میں اکیلا اپنی ٹہنی کے ساتھ لگا سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ یوں بے سہارا پڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ میرے باقی تین ساتھی خوش قسمت تھے کہ میرا ساتھ چھوڑ کر مکتی پراپت کر گئے۔ انھیں نروان مل گیا۔ اور میں یہاں تین مورتی مارگ کے سامنے والی بڑی سی عمارت کے ایک کونے میں پڑا سسک رہا تھا میرے پاس دبکی کلیاں کانٹوں سے لہولہان ہو کر مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن میں خاموش تھا۔ وہ مجھ سے سننا چاہتی تھیں۔ اس گرنتھ کا انتم ادھیائے جو اب لکھا جا رہا تھا۔ وہ میری آنکھوں

سے دیکھنا چاہتی تھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کو۔ لیکن میری زبان جیسے کٹ گئی تھی۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں تو قوت گویائی سے محروم ہو کر رہ گیا تھا۔

کلیوں نے بات کرنی چاہی۔

پتیوں نے سرگوشی کی

کانٹوں نے سوال کیے

لیکن میرے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

میں خود ایک سوال بن کر ٹہنی کے ساتھ ساکن لٹکا تھا۔ کاش اس سوال کا کوئی جواب مل سکے۔

اور پھر اچانک ہوا کا ایک تُند ریلہ آیا۔ میرے چاروں طرف جیسے بگولے سے ناچنے لگے، میں جیسے بیہوش سا ہو گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کیا ہو رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا جیسے میں اُڑ رہا ہوں۔ ٹہنی سے ایک دم الگ ہو گیا ہوں ہوا کے کندھے پر سوار کہیں جا رہا ہوں، آسمان کی طرف بلندیوں کی سمت اور جب مجھے ہوش آیا۔ جب میں نے اپنے آپ کو سنبھالا تو میں نے دیکھا میں پہاڑوں کے اوپر سے اُڑتا ہوا ایک وادی کی طرف آرہا تھا بلندی سے کم بلندی کی طرف۔ نیچے سرسبز گھاس پھیلی تھی ایک ندی کا نیلا پانی بہہ رہا تھا اور اس میں گول گول پتھر پڑے لہروں کا راستہ روک رہے تھے میں نے اپنے آپ کو اور سنبھالا۔ ایک سفید آنچل مجھے چھو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، دوبارہ جھپکیں میں شاید خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا نہیں خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ میرے قریب تو اندرا جی بیٹھی تھیں سفید ساڑھی پلیٹے اداس لگا ہوں سے نیچے پھیلی وادی اور اس میں بہتی ہوئی نڈر ندی کو دیکھتی۔ یہ پہلگام کی وادی تھی جہاں وہ اپنے پتا کے ساتھ کئی بار آئی تھیں اور جس سے ان سب کو ایک ذہنی لگاؤ تھا۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس سرخی سے کہانی کی آخری سطر لکھ دی گئی۔ راکھ کی آخری مٹھی ندی کی لہروں پر بکھر کر بچھتر برس سے لکھے جاتے ہوئے گرنتھ کی تکمیل کر رہی تھی۔

میں نے سفید آنچل کو آخری بار چھوا۔

گھر کی بیٹی کو آخری بار پرنام کیا۔

اور گرنتھ کے آخری صفحے پر گر کر نمکت ہو گیا۔

مجھے بھی نروان مل گیا اور میرے ساتھ ان کروڑوں پھولوں کو بھی جنہوں نے انتم پوجا میں حصّہ لیا تھا۔

اور اب میں اور میرے تینوں ساتھی گلاب کے پھول، جو میرے ساتھ ایک ہی شاخ پر کھلے تھے اور پھر دھیرے دھیرے جدا ہو گئے تھے۔ ہم سب ساکشی ہیں اس بات کے کہ راکھ کے ان ذروں سے جو ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں ہندوستان کا مستقبل بنے گا روشن اور مضبوط مستقبل۔

اور میرے ساتھ ساکشی ہیں لاکھوں میلوں میں پھیلے ہوئے کھیت اور کنوارے میدان اور برف سے ڈھکی چوٹیاں اور سمندر سے ملتے ساحل، اور ان سب دریاؤں کے تٹ جہاں تہذیب نے پہلی بار سورج کی روشنی

دیکھی تھی اور وہ سارے کسان جو اس تہذیب کے رکھوالے ہیں، اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور پنگھٹوں پر گونجتے لوک گیت اور راجنتا اور ایلورا میں بکھرے نقاشی۔ یہ سب اور ان سب کے ساتھ دلوں میں گونجتی دھڑکنیں اور ماتھوں پر رقصاں مضبوط ارادے گواہ ہیں کہ ہمیں انسان کی عظمت اور اس کی شرافت کا یقین ہے۔

ایک دُوسرا بھوپال نہ بنایئے

عام طور سے جاوید سکول جاتے وقت مجھ سے نہیں ملا کرتا تھا۔ صرف ماں سے لنچ کا ڈبہ لے کر اور اُسے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل جاتا تھا۔ لیکن آج وہ میرے کمرے میں آیا۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اخبار سے نظر ہٹا کر میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے جاوید؟"

"آپ سے اجازت لینے آیا ہوں، ابا جان۔"

"کاہے کی اجازت؟"

"آج سکول کے بچے ایک امن مارچ کر رہے ہیں۔"

"کہاں جاؤ گے تم لوگ؟"

"کاربائیڈ گیس فیکٹری ابا جان۔"

"مگر فیکٹری تو بند پڑی ہے۔ پچھلے چار سال سے۔"

"آپ میرا بینر دیکھیے ساری بات سمجھ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر جاوید نے کپڑے کا تہہ کیا ہوا بینر میرے سامنے کھول دیا۔

بہت موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

ساری دُنیا کو دوسرا بھوپال نہ بناؤ۔

"ہر بچے کے پاس اپنا اپنا بینر ہو گا۔"

"کِن سکولوں کے بچے ہوں گے، اس مارچ میں؟"

"صرف ان علاقوں کے بچے جہاں ۲ دسمبر ۱۹۸۴ء کو آدھی رات کے بعد کاربائیڈ فیکٹری سے نکلی زہریلی گیس نے قیامت ڈھائی تھی۔ یہ سب وہ بچے ہیں جو زہریلی گیس کی زد میں آئے تھے۔"

"تمہیں معلوم ہے انسانی جانوں کا کتنا نقصان ہوا تھا۔؟"

"ماسٹر جی نے اس بارے میں بتایا تھا دو تین دن پہلے، جب امن مارچ کرنے کے فیصلہ ہوا تھا۔"

"جاوید اصل نقصان کا کم لوگوں کو اندازہ ہے۔ میں بتاتا ہوں۔"

"بتائیے ابا جان۔ میں اپنے سب دوستوں کو تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"دو دسمبر کی آدھی رات کے بعد کاربائیڈ فیکٹری سے جب زہریلی گیس نکلی تو تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس کے اثر سے لوگوں کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں سے پانی برسنے لگا۔ اور حلق میں بڑی تیز جلن ہونے لگی۔ مرد، عورتیں، بچے سب گھروں سے باہر نکل کر سڑکوں پر بھاگنے لگے۔ بابا کار مچ گیا۔"

"کن کن علاقوں پر گیس کا زیادہ اثر پڑا تھا، ابا جان؟"

"بھوپال ریلوے اسٹیشن کے ادھر کے سارے علاقے، چولا کانچی، نشاط پورہ، ریلوے کالونی، جہانگیر آباد، جے پی نگر، قاضی کیمپ اور ان کے علاوہ فردوس نگر، شاہ جہان آباد اور ریلوے اسٹیشن کا علاقہ۔"

"کتنے لوگ مرے تھے؟"

"تین ہزار کا اندازہ ہے۔ لیکن دو لاکھ سے اوپر لوگ کسی نہ کسی طرح سے اپاہج ہو گئے تھے۔"

"دو لاکھ سے اوپر!" جاوید نے درد بھری آواز میں کہا۔

"سنو، اس آفت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے؟"

"وہ کیا ابا جان؟" جاوید نے ڈرتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اس کی نظریں اپنے پیٹر کے الفاظ پر جمی تھیں۔ یہ عبارت اس کے ماسٹر جی نے ہی لکھوائی تھی۔

"تین ہزار مرنے والوں میں پندرہ سو بچے، پانچ سو بالغ اور ایک ہزار بڑی عمر کے لوگ تھے۔"

"بچے اتنی زیادہ تعداد میں مرے تھے ابا جان؟"

ہاں، بڑا انسانہ تو وہی معصوم تھے لیکن میں ایک دوسری بات بتانا چاہتا ہوں۔"

اسی لمحہ جاوید کی امی بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

"کون سی دوسری بات بتا رہے ہو میرے بیٹے کو؟"

"تم بھی سن لو۔ میں جاوید کو بتا رہا تھا کہ کاربائیڈ فیکٹری سے نکلی زہریلی گیس سے تین ہزار موتیں ہوئی تھیں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہزاروں لوگ تو ابھی بھی دکھ جھیل رہے ہیں۔"

"میں جاوید کو اس ٹریجڈی کا دوسرا پہلو بتا رہا ہوں۔"

"بتائیے۔"

"زہریلی گیس سے مرنے والے پندرہ سو بچوں کی زندگی کے کم سے کم چالیس سال ضائع ہوئے تھے۔ پانچ سو مرنے والے بالغوں کی زندگی کے تیس سال اور بڑی عمر کے مرنے والے ایک ہزار لوگوں کے لگ بھگ دس سال ان سے چھین لیئے

گئے تھے۔ جانتی ہو اس کا مطلب ؟"

"بتایئے۔"

"یعنی اس زہریلی گیس نے انسانی زندگی کے تقریباً پچاسی ہزار سال انسان سے چھین لیے تھے۔"

"میرے اللہ!" جاوید کی امی چیخیں

"ابا خلیجی جنگ تو انسان کو اس کی زندگی کے کئی کروڑوں سالوں سے محروم کر دیگی۔ اس جنگ کو تو فوراً رکنا چاہیئے۔"

"اسی لیئے میں تمہیں خلیجی جنگ کے خلاف ہونے والے امن مارچ میں شامل ہونے کی اجازت دیتا ہوں۔ اپنا بینر سب سے اونچا رکھنا میرے بچے۔"

میں نے جاوید کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اس کی امی نے بھی اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کے گال چومے اور کہا۔

"جاؤ اللہ تم سب کی حفاظت کرے گا۔"

پھر وہ اپنا تہ کیا ہوا بینر بغل میں دبائے اپنے سکول کو روانہ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ میں نے امن کے ایک سپاہی کو جنگ کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دیکر اسے محاذ پر بھیج دیا تھا۔

دوپہر تک کاربائیڈ گیس فیکٹری کے بند گیٹ کے سامنے ہزاروں بچے جو امن مارچ میں اپنے اپنے بینر لئے شامل ہوئے تھے بڑے ڈسپلن سے جمع ہو گئے تھے۔

کئی میلوں کا فاصلہ طے کر کے اور خلیجی جنگ کو فوراً بند کرنے کے نعرے لگاتے ہوئے بچے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اپنے استادوں کے ساتھ آتے گئے اور کھلی جگہ پر بیٹھتے گئے۔ امن کے یہ معصوم سپاہی اپنے معصوم جذبوں کی قندیلیں لئے جنگ کے زہر آلود اندھیرے کو مٹانے کی آرزو کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کی چار دیواری سے نکل کر باہر کی غیر محفوظ فضا میں آ گئے تھے۔

معصوم آواز میں اونچے معصوم نعرے گونج رہے تھے۔

"پریذیڈنٹ بُش اور صدام حسین جنگ فوراً بند کر دو۔"

"دُنیا کے معصوم بچوں کو تباہی سے بچاؤ۔"

"توپوں کے دہانے بند کر دو۔"

"معصوم لوگوں کا خون نہ بہاؤ۔"

"دُنیا کو دوسرا بھوپال بنانے سے باز آجاؤ۔"

بڑی عمر کے بچے جن کے ماں باپ زہریلی گیس سے متاثر اسپتالوں میں دُکھ بھوگ رہے تھے، اونچی جگہ پر کھڑے بلند آواز میں مختصر تقریریں کر رہے تھے۔ ہر تقریر کے بعد خاموش بیٹھے بچے اونچے اونچے نعرے لگاتے تھے۔ بچوں کے اس بہت بڑے ہجوم کو پولیس کے سپاہیوں نے گھیر رکھا تھا لیکن وہ صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔ انھیں خود احساس تھا کہ اگر جنگ جلدی نہ روکی گئی تو اس کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ آس پاس کے علاقوں کے مرد اور

عورتیں بھی جمع ہو رہی تھیں اور اب انہوں نے بھی بچّوں کے نعروں میں اپنی اپنی آوازیں شامل کرنا شروع کردی تھیں۔ ان میں وہ عورتیں اور مرد بھی شامل تھے جو زہریلی گیس کے حادثے کے چھ سال بعد بھی اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں چکر کاٹ رہے تھے۔ میں معمول کے مطابق تیار ہو کر دفتر چلا گیا تھا لیکن من نہیں لگ رہا تھا، کام میں۔ آدھے دن کی چھٹی لے کر آ گیا۔ کچھ دیر یونہی بنا کسی مقصد کے اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر کاربائیڈ فیکٹری کے بند گیٹ کے سامنے بچّوں کی بھیڑ کے چاروں طرف کھڑے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ میں جب وہاں پہونچا تو جاوید تقریر کر رہا تھا۔

دوستو! دنیا آج کل بہت ہی نازک دور سے گذر رہی ہے۔ بڑی بڑی طاقتیں اپنے اپنے فوجی ہتھیاروں کو ٹیسٹ کرنے کے بہانے تلاش کر رہی ہیں۔ مرنے والوں میں زیادہ تر تعداد ان ہی کی ہے جو نہ جنگ چاہتے ہیں اور نہ جنگ میں شریک ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میرے ابّا نے آج صبح مجھے بتایا کہ بھوپال کی زہریلی گیس نے انسانی زندگی کے بچاسی ہزار سال انسانوں سے چھین لئے تھے۔ جبکہ مرنے والوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

میرے معصوم ساتھیو اور دوستو! کیا آپ چاہیں گے کہ خلیجی جنگ ہمیں انسانی زندگی کے اربوں سال سے محروم کر دے!

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں" بچّوں کا بھاری ہجوم چیخ اُٹھا۔

اس معصوم آواز میں میری اپنی آواز بھی شامل ہو گئی۔

میں نے بھی کہا "ہرگز نہیں" اور چاروں طرف کھڑے لوگوں نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔

پھر جاوید نے اپنا بینر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہجوم سے کہا۔

"میرے بھائیو پڑھو اس عبارت کو"

کاربائیڈ فیکٹری کے باہر کی خاموش فضا میں ایک ہی بلند آواز گونج رہی تھی۔

سارى دُنیا کو دوسرا بھوپال نہ بناؤ
ہم معصوم بچّوں کی آواز سنو

جاوید پھر بچّوں کی بھیڑ سے مخاطب ہوا۔

اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو ہم یہ امن مارچ بھوپال سے شروع کر کے عراق اور کویت کی سرحدوں پر پہونچ جائیں گے۔

جاوید گیٹ کے ساتھ والی اونچی جگہ سے اُتر کر اپنی ٹکڑی میں شامل ہو گیا۔ میں ایک طرف کھڑا امن کے ان ہزاروں پیامبروں کو سلام کر رہا تھا اور رومال سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ جیسے بموں اور توپوں کا زہریلا دھواں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے مجھ تک بھی پہونچ گیا تھا۔

ایک نہایت ہی حسین عورت سے نہایت ہی گہرا عشق کرنے کے بعد اگر اُسے اچانک ہی چھوڑ دینا پڑے اور پھر آپ ایسی سچویشن میں پھینک دئے جائیں کہ آپ کو ایک نہایت ہی بدصورت عورت سے محبت کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو آپ کے ذہن کی کیا کیفیت ہوگی؟ بس یہی ایک سوال ہے جو آج کل میرے وقت کا ہر لمحہ مجھ سے پوچھتا رہتا ہے۔ ڈھیر سارے لمحوں نے سوالوں کا ایک انبار میرے سامنے لگا دیا ہے اور میرے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں۔ میرے ہونٹ سِلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ زخموں پر بہار ہے۔ لیکن زخموں کی زبان کون سمجھتا ہے۔ سبھی ہونٹوں سے نِکلے الفاظ پر مرتے ہیں۔ زخم سے نِکلتی ہوئی ٹیس کی گونج کِسے سُنائی دیتی ہے؟

چنڈی گڑھ چھوڑنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے مجھ میں کسی خوب صورت چیز کو چاہنے اور اُس پر قربان ہو جانے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے اور اب میں ایک ایسے شہر میں ہوں جو بڑا تاریخی شہر ہے اور جس کی ہر گلی اور ہر مکان میں تاریخ کے واقعات دفن ہیں۔ یہ شہر ایک ایسی کتاب ہے جس میں کاغذ کی جگہ بھوج پتر استعمال کیا گیا ہے اور وہ اِتنا پُرانا ہے کہ ہاتھ لگانے سے بھی جھڑنے لگتا ہے۔ اس شہر کے ہر مکان کی ہر دیوار بھوج پتر کی بنی ہوئی ہے۔ لگتا ہے جھکڑ کے ایک ہی زوردار ریلے سے سارے مکان اُڑنے لگیں گے اور اُن میں رہنے والے فضا میں معلق ہو جائیں گے۔

اور اِن دِنوں میں اِسی شہر کی ایک تنگ سی گلی میں ایک پُرانے مکان کی اُوپر والی منزل میں ایک صاف کمرے میں رہتا ہوں۔ یوں تو یہ عمارت بھی بھوج پتر کی ہی بنی ہوئی ہے۔ لیکن اِس کی بُنیادیں مضبوط ہیں کیونکہ اُن میں ایک دوست کی محبت کا جاندار مسالہ بھرا ہے۔ اِس لئے کسی بھی جھکڑ کے ریلے اِسے نہیں اُڑا سکیں گے اور وہ منظر بھی کتنا عجیب ہوگا جب تمام شہر کی عمارتیں طوفان کی زد میں آ کر فضا میں جھول رہی ہوں گی اور لوگ اپنے لرزتے ہوئے کمروں کی کھڑکیوں میں سے خوفزدہ ہو کر نیچے جھانک رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور اِدھر میں اور میرا دوست اپنے اِس چھوٹے سے خوبصورت کمرے میں بیٹھے فضا میں جھولتے ہوئے تمام شہر کو اور اُس کی تمام تواریخ کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے کہ ہر تاریخ کا یہی حشر ہوتا ہے۔

اور ہر تاریخ کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔

بس کچھ اسی قسم کے آوارہ سے خیالات آج کل میرے ذہن میں جنم لیتے رہتے ہیں۔

میرا دوست اگرچہ کوئی امیر آدمی نہیں۔ لیکن یہ مکان اُس کا اپنا ہے۔ اپنا اس لحاظ سے کہ اُس کے والد کو پاکستان میں چھوڑی ہوئی جائداد کے عوض جو کچھ ملا ہے اُس میں یہ مکان بھی شامل ہے۔ اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق اِس پُرانی عمارت میں کچھ ردّ و بدل کر کے اُسے اچھا خاصا قابلِ رہائش بنا لیا ہے۔ اوپر کی منزل میں میرا دوست اور اُس کے بچے رہتے ہیں اور نچلے حصّے میں کرائے دار۔ جس کمرے میں میں رہتا ہوں اُس کی سامنے کی دیوار میں ایک مستطیل قسم کا آئینہ جڑا ہے۔ میں شیو وغیرہ کرنے کے لئے یہی آئینہ استعمال میں لاتا ہوں۔ میں جب بھی اِس آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں نجانے کیوں مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ آئینے کے اندر سے کئی چہرے میری طرف دیکھ رہے ہیں کئی آنکھیں مجھ پر جمی ہیں اور کئی ہونٹ کچھ کہنے کو بے تاب ہیں۔ کبھی کبھی ایک خوبصورت عورت کا چہرہ سارے آئینے پر چھا جاتا ہے اور مجھے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہو۔

، میں سوچتی ہوں۔ میں اِسی کمرے میں سویا کرتی تھی۔ میں جب بیاہ کر لائی گئی تھی تو اِسی کمرے میں میں پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔ اسی کمرے میں میرا پہلا لڑکا پیدا ہوا تھا اور پھر یہیں میرے دوسرے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں اور پھر مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑا تھا۔۔۔۔۔،

اور اِس سرگوشی کے ساتھ آئینے کی سطح سے پانچ چھوٹے خوبصورت بچّے اُبھرنے لگتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے گلابی ہونٹ اپنی معصوم اور دلنواز مسکراہٹوں سے آئینے میں دیوالی کے چراغ روشن کر رہے ہوں اور میرا کمرہ ایکدم روشنی کے تلاطم میں ڈوب جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے یہ معصوم مسکراہٹیں امن اور شانتی اور بھائی چارے کی روشنی ہیں جو ایک نہ ایک دن ساری دُنیا کو نُور میں نہلا دے گی اور ہر آئینے میں انسان اپنے مستقبل کو سنورتا اور نکھرتا ہوا دیکھے گا۔

اور مجھے ایکدم یاد آ جاتی ہے نوشہرہ کی سطحِ مُرتفع پر بنی ایک حویلی جس کے ایک حصّے میں بٹوارے سے پہلے میں رہا کرتا تھا۔ سونے والے کمرے میں ایک الماری تھی۔ جس میں ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں اس آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو کئی پہلوؤں سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے شاید اپنے سارے ہی پہلو دیکھ لئے تھے اور اِس کے ساتھ ہی میں نے انسان کے بھی سبھی پہلو دیکھے تھے اور اُن پر سوچا بھی تھا۔ لیکن ایک پہلو سدا ہی میری آنکھوں سے دُور رہا اور وہ انسان کے کردار کا وہ پہلو تھا جو اُسے خوبصورت ہونٹوں پر کبھی معصوم مُسکراہٹوں کو چھین لینے پر بھی اُکساتا ہے۔ بسے ہوئے گھروں کو جلانے پر بھی آمادہ کرتا ہے اور اپنی شرافت اور انسانیت کو اُبلتے ہوئے خون کے دریا میں غرق کر دینے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو تھا جس نے ایک روز رات کے گہرے اندھیرے میں مجھے وہ حویلی چھوڑ کر تمام رات کھیتوں میں گزارنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اُس رات اُس حویلی میں آگ لگا دی گئی تھی اور میرا سامان اور میری کتابیں اور میرے مسودے اور میری کہانیاں اور نظمیں اور میری تدریں اور میرے وہ پہلو جنھیں میں آئینے کی مدد سے

سنوارا کرتا تھا، جلا کر راکھ کر دیئے گئے تھے اور جب اُس حویلی کے اُوپر والے کمرے سے آگ کے شعلے لپک کر آسمان کو چھونے لگے تو میرے ذہن میں ایک بہت زور کا دھماکہ ہوا جیسے میرا دماغ پھٹ گیا ہو۔ شاید اُسی لمحہ میرے کمرے کا قدِ آدم آئینہ آگ کی تپش سے تڑاخ سے ٹوٹ گیا تھا اور اِس کے ساتھ ہی اُس شہر سے میری تمام وابستگیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سارے رِشتے منقطع ہو گئے تھے، سارے بندھن ختم ہو گئے تھے۔ میرا اُس شہر اور اُس شہر کی گلیوں سے اب کیا رشتہ رہ گیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں اور میں اگلی صبح اُس بڑے سے آئینے کی دھوئیں سے کالی سیاہ ہوئی کرچیاں اپنے دامن میں سنبھالے ایک ایسی راہ پر چل پڑا جو اُس راستے سے مختلف تھی، جس پر میں اب تک چلتا آیا تھا اور اب جو راہ میرے سامنے ہے اُس پر ہزاروں سنگِ میل ہیں لیکن منزل کہیں نہیں۔ اگر کہیں ہے تو نظر نہیں آتی۔ شاید فیض کو بھی وہ منزل ابھی نظر نہیں آئی جبھی تو اُس نے کہا ہے ؎

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور اب دھوئیں میں لتھڑی وہ کالی سیاہ کرچیاں ہی میری دولت ہیں۔ میرا سرمایہ، میری پُونجی۔ میں انھیں یوں سنبھال رہا ہوں جیسے کوئی بھکاری اپنی دن بھر کی بھیک کی کمائی کو سنبھال رہا ہو۔

کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ اُس آئینے پر ایک کہانی لکھوں جو میرے کمرے کی سامنے والی دیوار میں چاند کی طرح چمکتا رہتا ہے اور اُن تمام چیزوں کے نقوش اُبھاروں جو دن رات اُس کی چمکتی ہوئی سطح کے نیچے سے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ رُوحی کے ماتھے پر بکھری ہوئی زلف کی کہانی کہوں جس نے اِسی کمرے میں پہلی بار اپنی پاکیزہ محبت سے ایک کنگال مرد کو مالا مال کر دیا تھا اور اُس کے پانچ بچّوں کی معصوم مسکراہٹوں کا ذکر کروں جو اپنی مُسکراہٹوں کے نُور سے انسان کے حسین مستقبل کی گواہی دیتے ہیں۔ بس۔ یہی تھیم ہو گا میری اگلی کہانی کا!!!

مُشک رنگی ہرنی

یہ ایک طرح سے اُس کا پنجاب سے باہر پہلا سفر تھا۔
جب وہ ضلع لُدھیانہ کے اپنے چھوٹے سے گاؤں تاج پُور کے ہرے بھرے کھیتوں کی آخری حدوں سے باہر نکلی تو اُس کی ماں دلبیر کور اُس کے ساتھ تھی اور جب وہ اپنے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوئی تو اُس کی ماں پلیٹ فارم پر بہت دیر کھڑی رہی اور دُھوپ میں چمکتی ہوئی پٹریوں کو دیکھتی رہی اور ریلوے انجن کا دھواں فضا میں بکھرتا رہا اور ریل کے سُرخ سُرخ کمپارٹمنٹ آخر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ تھرڈ کلاس کے سلیپنگ کوچ کی کھڑکی کے ساتھ لگی سیٹ کے سہارے بیٹھی من جیت کچھ دیر تک تو اپنی ماں کے بارے میں سوچتی رہی اور اُس کی ہدایات کو یاد کرتی رہی اور اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی رچتی رہی اور پھر اس کے بعد وہ اپنے طویل سفر کے بارے میں سوچنے لگی جو اُس کے سامنے تھا۔ دہلی تک تو وہ اپنے کالج کے زمانے میں ایجوکیشنل ٹُور پر دو ایک بار آئی تھی۔ لیکن وہ تو کنڈکٹِڈ ٹُور تھے، اِس لئے سارا پروگرام نپا تُلا تھا اور اُسے کہیں کوئی دشواری نہ ہوئی تھی اور نہ ہی کسی فکر نے اُسے یا اُس کی دُوسری فرینڈز کو پریشان کیا تھا۔ بلکہ دہلی کے تال کٹورہ گارڈن میں جب اُنھوں نے پنجابی گِدا ڈالا تھا اور اپنے شوخ رنگوں کے گوٹے کناری سے لدے کپڑوں کے ساتھ اپنی بلند لیکن سنگیت بھری آواز میں بولیاں گُونجائی تھیں۔ تو دل کی دھڑکنوں پر پنجاب کی اَلہڑ جوانیوں کے کٹورے چھلک چھلک گئے تھے۔ اِس سے گاڑی میں بیٹھے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بہت برس پہلے تال کٹورہ گارڈن کی فضا میں گونجی ہوئی ایک بولی کی کڑی چھن سے اس کے ذہن کے آنگن میں آ گری تھی اور سارا ماحول چمک اٹھا تھا۔

کالی تتری کماد وں نکلی
تے اُڈدی نُوں باج پہ گیا

(کالے رنگ کی تتری۔ ایکھ کے کھیت سے اُڑان بھر کر نکلی ہی تھی کہ اُسے باز نے دبوچ لیا۔)

اور یہ چمک دھیرے دھیرے اُس کے پتلے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اُس کی دوسری کولیگ کرتار گور جو اُس کے ساتھ ہی جا رہی تھی اور جالندھر سے اسی کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر آئی تھی۔ اچانک ہنس پڑی۔

"دن میں بھی سپنے دیکھ رہی ہو؟"

من جیت یہ سن کر جھینپ گئی اور پھر دھیرے سے مسکرا دی۔

"نہیں تو۔"

"جانتی ہو دن میں سپنے دیکھنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔"

"وہ تو سسی پنوں کے تھلوں کی بات تھی، جہاں اُفق تک ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ اب کون راستہ بھول سکتا ہے۔ راہوں کے جال بچھے ہیں ہر طرف۔"

"تم بھی تو میدانوں میں قلانچیں بھرنے والی ایک ہرنی ہو جو اب پنجاب کے ہرے بھرے کھیتوں کو پھلانگتی ہوئی مدھیہ پردیش کے دُور دراز آدی واسی کشیتر میں جا رہی ہو۔"

"ہرنی جب اپنی ڈار سے بچھڑ جائے تو جانتی ہو کیا ہوتا ہے؟"

"اُس کے ساتھی بدحال ہو جاتے ہیں۔"

"نہیں۔ اس کی اپنی رگ رگ کٹنے لگتی ہے درد سے۔"

تہی سدا تڑفدی رہویں

نی ہرنئے مُشک رنگیئے

(او کالے رنگ کی ہرنی تو بھی زندگی بھر تڑپتی رہے)

من جیت کی اِس بولی کو سن کر کرتار کور کو لگا کہ وہ ایک مشک رنگی ہرنی کو ساتھ لئے انجانی خدوخال راہوں پر چلتی جا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ راہیں اُسے کہاں لے جا رہی تھیں۔

اُس رات جب وہ نئی دہلی سے رتلام جانے والی گاڑی میں ایک ہی سیٹ پر ساتھ ساتھ لیٹی تھیں تو کرتار نے کہا۔

"اب تم بیاہ کر لو، نہیں تو یونہی بوڑھی ہو جاؤ گی۔"

"تمہیں دار جی بہت یاد آ رہے ہیں کیا؟" من جیت نے پوچھا۔

"ہاں۔ اِس سمے وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے ہیں اور میں اُن کا ماتھا دباتی رہتی ہوں اور پھر دھیرے دھیرے اُن کی آنکھ لگ جاتی ہے۔"

"اور پھر تم آہستہ سے کھسک جاتی ہو؟"

"صرف تھوڑی دیر کے لئے۔"

"اُس کے بعد؟"

"اُس کے بعد تو پھر ساری رات جاگنا ہی ہوتا ہے۔"

"اسی لئے میرا بیاہ کرانا چاہتی ہو کہ میں بھی ساری رات جاگتی رہوں۔ کرتار مجھے نیند بہت پیاری لگتی ہے۔ میری ماں بھی کبھی مجھے نہیں جگاتی۔ میں اپنی راتیں حرام نہیں کروں گی۔"

"اری بڑا سکھ ملتا ہے اپنی نیندیں خراب کرنے میں۔"

"تو تم یہ سکھ لیتی رہو۔ میں تو سونے لگی ہوں۔"

من جیت نے یہ کہہ کر کروٹ لے لی اور کرتار اُس کے جسم سے نکلتی ہوئی آنچ سے دھیرے دھیرے جلتی رہی اور اسے اس کے دارجی یاد آتے رہے جو اب اکیلے کھاٹ پر پڑے جاگ رہے ہوں گے۔ اچھا ہوتا اگر وہ اتنے لمبے سفر پر نہ آتی۔ اُسے تو صرف نئی نئی جگہیں دیکھنے کے موہ نے مار اتھا۔ دارجی کی اسے اور تو سب باتیں پسند تھیں لیکن اُسے گھر میں قید رکھنے کی خواہش اور اُن کے جسم سے نکلتی ہوئی پسینے کی بُو اُسے پسند نہ تھی۔ جانے کتنا زیادہ پسینہ آتا تھا دارجی کو۔ کم بخت گرمیوں سردیوں ایک ہی مقدار میں پھوٹتا رہتا تھا اُن کے جسم سے اور ایک ہی طرح کی بُو پھیلاتا رہتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بہت سکھی تھی اور گھر کو چھوڑنا اُسے گوارا نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ دارجی کبھی کبھی نشے میں مست آدھی رات کو گھر آکر اُسے گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ بانجھ ہے اور اگر وہ اِسی طرح بانجھ رہی تو وہ دوسری عورت لے آئیں گے۔ اُس گھڑی کرتار کو بہت رنجیدہ ہو جاتی تھی اور چپکے چپکے روتی رہتی تھی۔ اور دارجی اُس کے ساتھ سٹ کر رات کے پچھلے پہر خراٹے بھرنے لگتے تھے۔

کرتار نے جب من جیت کی دیہہ پر ہاتھ رکھا تو اُسے لگا جیسے اُس نے ڈھلتی دوپہر کے تپے سنگِ مرمر کی کسی سِل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کتنا گٹھا ہوا اور صحت مند جسم تھا من جیت کا اور کس بے نیازی اور سکون سے وہ پل پل ہچکولے کھاتے ہوئے اِس کمپارٹمنٹ کے لکڑی کے سخت تختے پر سو رہی تھی۔

اگلے روز اندورت جب وہ بس میں بیٹھ کر بستر ضلع کے ایک گاؤں میں پہنچیں تو من جیت ایکدم اُداس ہو گئی۔

"کتنا بڑا فرق ہے پنجاب اور اِس آدی واسی کھشیتر میں۔ لگتا ہے تہذیب ابھی ایک صدی پیچھے ہے یہاں۔"

"لیکن عورتوں میں کتنی سادگی ہے۔"

"سادگی نہیں، جہالت ہے۔ علم شاید سادگی کو کم کر دیتا ہے، لیکن دماغ میں تو روشنی پھیلاتا ہے، یہاں روشنی بہت کم ہے۔"

"لیکن یہ ہلکا ہلکا اندھیرا پیارا بھی تو لگتا ہے۔"

کرتار کو رکا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ کچھ آدی واسی جوان لڑکیاں اپنی مختصر سی نیلی ساڑھیاں سنبھالے ننگے سر اور ننگے پاؤں لئے سیاہی مائل ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا اُجالا پھیلائے ہوئے ان کے لئے ڈھلی ہوئی صاف پیالیوں میں خوب اُبلی ہوئی تیز چائے لے کر آگئیں۔

من جیت نے چائے کی پیالی لے لی اور مسکرائی اور اُسی لمحہ چائے دینے والی آدی واسی لڑکی کے بالوں میں ٹھُسا ہوا ایک پھول اچانک ڈھیلے ہو گئے بالوں میں سے نیچے گر گیا۔ کرتار نے اس پھول کو اُٹھا کر دوبارہ لڑکی کے بالوں میں

لگا دیا اور اس کے ست رنگے گالوں میں ہلکی سی شفق چھلک اُٹھی۔

رُوپ کنواری دا

جیویں دِیوں چڑھدے دِی لالی

(ایک حسین اَلہڑ دوشیزہ کے حُسن کا نکھار سحر کے وقت پھیلی ہوئی شفق کی مانند ہے۔)

من جیت نے اِس بولی سے کرتار کو مخاطب کیا اور وہ آدی واسی لڑکیاں بغیر اس کا مطلب سمجھے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں زیادہ روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے پاس محبت کے روشن چراغ ہیں۔" یہ کہتے ہوئے من جیت نے کڑوی کسیلی چائے کا ایک مختصر سا گھونٹ لیا۔

"گڈ نِٹی" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور لڑکیوں کی اندھیروں اُجالوں میں لپٹی وہ ٹولی ایکدم خوش ہو گئی۔

صوبائی کلچرل ایکسچینج کے اِس پروگرام میں شام کو منڈورام کے ایک شاعر نے اپنی نظم سنائی۔ اس نے نظم سنانے سے پہلے اپنا تعارف دیتے ہوئے کہا کہ وہ منڈورام کی راجدھانی آئی ذول سے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور پہاڑیوں کی اوٹ میں بسے ایک چھوٹے سے گاؤں ماہٹ کا رہنے والا تھا اور اس کا نام سائی زاہولا تھا اور اُس نے شیلانگ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مِنڈورام کے ایک مِنڈو شاعر لازوا کا ذکر کیا جس نے اپنی زبان میں صرف سو گیت لکھے تھے اور وہ بہت ہی چھوٹی عمر میں مر گیا تھا۔ لازوا کی تمام شاعری اوڈی کے گرد گھومتی تھی جو اُس کی محبوبہ کا نام تھا۔ سائی زاہولا کو دیکھ کر من جیت کو اپنا پنجابی زبان کا شاعر شِو کمار بٹالوی یاد آگیا جو ابھی دو برس پہلے اپنے گیتوں کی گونجوں کو تڑپتا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلا گیا تھا۔ جب سائی زاہولا نے بہت ہی دردناک آواز میں اپنی نظم سنائی تو من جیت کو لگا جیسے شِو بٹالوی اپنی نظم "شِکرا" اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اتنی اونچی اور درد بھری آواز میں گا رہا تھا کہ اُس کے دماغ کی رگیں پھٹ جانے کو تھیں۔

میں نے تمہارے لئے نئے دھان کی فصل کاٹ دی ہے۔

پہاڑیوں پر چاند کی روشنی پھیل رہی ہے۔

اور اس چاندنی میں پیلے دھان کی بالیاں

اپنی پلکوں پر تمہاری محبت کا درد سجائے۔

تمہارا انتظار کر رہی ہیں

میں اِس کٹی ہوئی فصل کو سمیٹے

اُس راستے کو دیکھ رہی ہوں

جو تمہارے گھر کو جاتا ہے۔

"اتنی زور سے مت گاؤ۔ مر جاؤ گے۔"

جانے من جیت کو کیا ہوا، اُسے بعد میں صرف اتنا احساس ہوا کہ وہ عورتوں اور مردوں سے بھرے ہوئے ہال میں اچانک زور سے چیخی تھی۔

اور پھر سب طرف خاموشی چھا گئی تھی اور سائی زاہولا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی سلگتی ہوئی سگرٹ کو انگلیوں میں زور سے مسل دیا تھا اور اُس کے چہرے پر بے پناہ کرب کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔

اُس سے اگلے روز کرتار کور نے دیکھا کہ من جیت اپنی نوٹ بک میں زاہولا کی نظمیں لکھ رہی تھی۔ اُس نے سُنا، وہ سائی زاہولا کو کہہ رہی تھی۔

"میں تمہاری نظموں کو پنجابی زبان میں ترجمہ کروں گی اور پھر تمہیں پنجاب بُلاؤں گی کہ تم اپنی اسی دردناک آواز میں سوہنی مہینوال کی محبت میں جلتی کسی دوشیزہ کی داستان، ہیر رانجھا اور سسی پنوں کی سرزمین میں رہنے والے لوگوں کو سناؤ۔ محبت کا پیغام ایک ہی ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں سنایا جائے۔"

"آئی شل کم" (میں آؤں گا)۔ اس نے جواب دیا تھا۔

"شی از مائی ویری ڈیر فرینڈ" (یہ میری بہت عزیز سہیلی ہے)۔ من جیت نے کرتار کا تعارف کرایا تھا، سائی زاہولا سے۔

"ڈیر اونلی ٹو یو؟" (صرف آپ کو عزیز ہے)

"اونو، ٹو ہر دارجی آلسو۔" (ارے نہیں — اس کے دارجی کو بھی)۔ . . .

"واٹ دارجی؟" (دارجی کیا؟)

"ہر ہسبینڈ۔" (اس کا شوہر)

اور یہ کہہ کر من جیت نے ایک زور کا قہقہہ لگایا تھا اور اس قہقہے میں سائی زاہولا کی مجروح ہنسی بھی گھُلنے لگی تھی۔

"یو ڈونٹ لاف۔" (تم ہنستے نہیں)

"ناٹ ایٹ اَدرز۔ اونلی ایٹ مائی سیلف۔" (دوسروں پر نہیں۔ صرف اپنے آپ پر)۔ اس نے جواب دیا۔

"سُنا یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ دوسروں پر نہیں ہنستا صرف اپنے آپ پر ہنستا ہے۔ شاید یہ نہیں جانتا کہ اپنے زخموں کو دیکھ کر ہنسنے والا یا کوئی یوگی ہو سکتا ہے یا پاگل۔"

"واٹ؟" (کیا؟) اُس نے بڑی تلخی سے من جیت سے سوال کیا۔

"یو آر اے فول۔" (تم بیوقوف ہو)

"تھینک یو مس —!" (شکریہ محترمہ)۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"مس من جیت۔" وہ بولی۔

"یس۔ آئی ایم اے فُول۔ اے بگ ایڈیٹ۔" (ہاں میں بیوقوف ہوں۔ ایک بہت بڑا بیوقوف)

اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے اور من جیت کو لگا جیسے اس نے انجانے میں سائی زاہولا کے زخموں کو اپنے لمبے لمبے ترشے ہوئے سُرخ ناخنوں سے کھُرچ دیا تھا۔ اور اُن سے خون کی بُوندیں برسنے لگی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائے جا رہا تھا۔ من جیت کو لگا جیسے اس کی زخمی رُوح کراہ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

او پنجاب کے ہرے بھرے میدانوں میں اُڑان بھرنے والی فاختہ
تم نہیں جانتیں کہ پہاڑوں کے جن کگاروں سے ٹکرا کر
میرے پنکھ ٹوٹے ہیں وہ کتنی سنگلاخ ہیں ـــــ یہ وہ
سرزمین ہے جہاں لازوا جیسا بے مثال شاعر
صرف سو لگیت لکھ کر خون تھوکنے لگا تھا اور
اُس کی اوڈی نے ایک نگاہ غلط انداز بھی
اُس کی طرف نہ پھینکی تھی۔
تم واپس چلی جاؤ اپنے محفوظ گھونسلے میں
ورنہ اِس کھُلے آسمان سے اچانک کوئی بجلی گر کر
تمہارے پنکھ جلا ڈالے گی۔

اور پھر کرتار نے دیکھا کہ ہر لمحہ قہقہہ لگانے والی من جیت کی آنکھوں میں اچانک آنسو چھلک آئے تھے اور اس نے اپنا گورا چٹا صحت مند ہاتھ سائی زاہولا کے کمزور کندھے پر رکھ کر اُسے سنبھال لیا تھا۔

آئی شیل ٹیک یو ٹو پنجاب وِتھ می سائی زاہولا۔ یو آر ناٹ ایلون اِن یور گریف۔ میں تمہیں اپنے ساتھ پنجاب لے جاؤں گی۔ صرف تم اکیلے ہی دُکھی نہیں ہو۔" اور وہ دھیرے دھیرے اُس کے کانوں کے قریب سرگوشی کے انداز میں بول رہی تھی۔ من جیت کے یہ الفاظ سن کر ایک ہلکی سی دھوپ سائی زاہولا کے آنسوؤں میں گھُل گئی۔

کرتار کور ایک طرف کھڑی تھی اور اُس کے ذہن میں دو روز پہلے والی پنجابی بولی کی کڑی گُونج رہی تھی۔

تُہی سَدا تڑفدی رہو بس
نی ہِرنئے مُشک رنگئے

آئی رین فار افریقہ

کوئی دس سال پہلے میں افریقی ملکوں میں جانے والے ایک وفد کے ساتھ گیا تھا یونیسکو کی اسا ین مینٹ تھی۔ میرے ساتھ کشمیر کی شانتی رمبھال بھی تھی۔ دراصل اسے شانتی رمبھال بنے تو دو ہی برس ہوئے تھے۔ پہلے وہ شانتی رمبھال تھا۔ پچھلے کئی برسوں سے اس میں سیکس کی تبدیلی کے آثار پیدا ہو رہے تھے اور اب تیسرے کامیاب اپریشن کے بعد شانتی رمبھال مکمل عورت بن گیا تھا۔

اور اب میرے ساتھ وفد میں جو تین لوگ تھے ان میں سری نگر کی شانتی رمبھال بھی تھی جو بلا کی حسین اور اتنی ہی انٹیلی جینٹ بھی تھی۔ اور وفد کے دوسرے لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ میرا تعلق بھی کشمیر سے تھا ہم دونوں کو الگ چھوڑ دیا تھا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ ہم دونوں بھی اِتھیوپین ایمبیسی میں پاسپورٹ اور ویزا لینے کے لئے ایک ہی وقت پہونچے تھے۔ ایک ہی قلم سے فارم بھرے تھے اور اسی قلم سے تین چار جگہوں پر اپنے دستخط کئے تھے اور جبھی جانا تھا کہ میرا کشمیر کی وادی سے پُرانا اور ٹوٹا ہوا رشتہ تھا اور شانتی رمبھال کا رشتہ پوری مضبوطی سے قائم تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے اس کا نام مسٹر شانتی رمبھال تھا اور اب وہ اپنے آپ کو مس شانتی رمبھال لکھتی تھی۔ ہم ادیس بابا میں راس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور ہم دونوں اس زمانے میں پہلے ہندوستانی تھے جنہیں بادشاہ ہیلی سی لاسی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا ایتھوپی لوگوں کا کہنا تھا کہ ہیلی سی لاسی دشمنوں کے لئے جتنا سنگ دل اور بے رحم تھا عوام کے لئے اتنا ہی رحمدل اور مہربان تھا۔ وہ جس محل میں رہتا تھا وہ سات میل کے رقبہ میں پھیلا تھا اور اس عمارت میں پہونچنے کے لئے سات گیٹوں سے گذرنا پڑتا تھا جن پر دن رات فوجیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ اپنے مخالف کو ختم کرنے کے لئے وہ بڑا عجیب وغریب حربہ استعمال کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس عمارت میں جہاں بادشاہ رہتا تھا بڑی شاندار دعوت ہوتی تھی جو کئی رات تک چلتی رہتی تھی اور جب دعوت ختم ہوتی تھی تو مہمانوں میں سے ایک مہمان کم ہو جاتا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مہمان کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے کسی دوست یا قریبی رشتہ دار کو یہ جُرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ بادشاہ سے اس کے بارے میں دریافت کر سکے۔

پھر کسی اگلی دعوت کا انتظام ہوتا تھا اور پھر ایک اور مہمان غائب ہو جاتا تھا لیکن ہیلی سی لاسی چرچ کی بڑی عزت کرتا تھا اور مذہب کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہ بولتا تھا۔ وہ جب کبھی ادیس بابا سے باہر جاتا تھا ایتھوپیا کے لوگ سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنی کار رکواتا تھا۔ کار سے باہر آکر اپنے لوگوں سے ملتا تھا اور غریب لوگوں اور خاص طور سے غریب، بیمار اور رکمزور بچوں کو ایتھوپین سکے دیتا تھا۔ ایتھوپیا کے لوگ اپنے بادشاہ کی خیرات کے عادی ہو چکے تھے۔ خود بادشاہ ملکوں کے کسی سیاسی گروپ میں شامل نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کے لئے جاپان، چین، روس، امریکہ سب سے مالی امداد لیتا تھا۔

میرا خیال ہے ہر کسی سے مالی امداد قبول کرنے کے اس عمل نے ایتھوپیا کے لوگوں کو خود کفیل نہیں ہونے دیا۔ اور انہیں ہمیشہ ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت ڈال دی۔ یوں تو سارے ہی افریقی ملک پچھڑے ہوئے اور غریب ہیں لیکن ہر ملک خیرات نہیں مانگتا۔ کم سے کم تنزانیا کے لوگ نہیں۔ پریذیڈنٹ نی رے رے اگرچہ خود ایک سکول ماسٹر تھا اور ایک عام آدمی تھا لیکن اس نے کبھی بھی کسی بیرونی طاقت کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ ایتھوپیا کی حالت دوسری تھی۔

بادشاہ ہیلی سی لاسی تو انتقال کر گیا لیکن خیرات لینے کی جو عادت وہ اپنے ملک کے لوگوں میں ڈال گیا وہ اب تک قائم ہے۔

میں نے اور شانتی رسبھال نے افریقی ملکوں کے دورے سے واپس آکر جو اپنی ذاتی رپورٹ لکھی اس میں اپنے اس نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ یہ رپورٹ ہم دونوں کا ذاتی ریکارڈ تھا۔ جس پر ہم دونوں کے دستخط موجود تھے شانتی رسبھال اپنا نام بولڈ حروف میں لکھتی تھی اور میں اپنا نام بڑے ہی چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھتا ہوں۔ جو جوائنٹ رپورٹ وفد کے چاروں ممبروں نے پیش کی اس میں بھی اس نقطۂ نظر کا ذکر تو تھا لیکن بہت کھلے الفاظ میں نہیں۔

آج صبح میں نے افریقی ملکوں کے بارے میں وہ رپورٹ جس پر شانتی رسبھال کے بڑے بولڈ حروف میں دستخط موجود ہیں، پرانی فائل میں سے نکال کر پڑھی ہے۔ فائل پر جمی گرد کو جھاڑا ہے اور رپورٹ کے صفحوں پر شانتی رسبھال کے شفاف اور خوبصورت چہرے نے بڑی مہربان مسکراہٹ سے مجھے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔

دراصل پچھلے کئی دنوں سے ہر روز ٹیلی ویژن پر سپورٹس ایڈ کے بارے میں بڑے بڑے لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سیاسی لیڈر بھی ہیں، فلم ایکٹر بھی ہیں۔ وزیر بھی ہیں جو عوام سے بار بار اپیل کر رہے ہیں کہ وہ افریقہ اور خاص طور سے ایتھوپیا میں قحط کے مارے بچوں کی مدد کے لئے ہندوستان کے سترہ شہروں میں آرگنائز کی جانے والی سپورٹس ایڈ میں زیادہ سے زیادہ رقم دیں۔ یہ ریس انجینئٹ ٹائم" ہے اور اس کا مقصد ترقی اور خود کفالت کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے افریقی ملکوں، خصوصاً بچوں کی مالی امداد کرنا ہے کیونکہ میرا تعلق یونی سیف سے ہے جو عالمی ادارہ عورتوں اور بچوں کی بھلائی کیلئے ہی کام کرتا ہے۔ اس لئے یہ میرا اخلاقی

فرض بھی ہے اور آفیشیل ڈیوٹی بھی ہے۔ اس لیے میری گہری وابستگی ہے اس پروگرام سے۔

آج صبح میں بہت جلدی جاگ گیا تھا۔

مجھے بھی تو سات بجے سے پہلے جواہر لال نہرو اسٹیڈیم پہونچنا ہے۔ ٹھیک سات بجے تو ریس شروع ہو جائے گی۔ اس ریس میں لگ بھگ تین ہزار لوگ حصّہ لے رہے ہیں۔ چھوٹی عمر کے بچّوں سے لیکر بڑی عمر کے لوگوں تک۔ ان میں عوام بھی شامل ہیں خواص بھی۔ کئی بچے اور آدمی تو پچھلے ایک ہفتے سے دوڑنے کی پریکٹس کر رہے ہیں۔ دس کلومیٹر کی دوڑ اتنی آسان بھی تو نہیں۔ پچھلے دو دنوں میں تو میں بھی صبح سویرے کچھ دیر دوڑ لگا رہا ہوں تاکہ تھوڑا ابھیاس ہو جائے۔ ورنہ میری عمر کے آدمی کو اچانک دس کلومیٹر دوڑنا پڑے تو مشکل ہو جائے۔

صبح چار بجے اُٹھ کر میں نے اپنے لئے خود ہی چائے کی پیالی بنائی ہے۔ ایک سگریٹ سلگایا ہے اور پھر شانتی سمبھال اور اپنی شتر کر رپورٹ کو پڑھا ہے اور ان سب لوگوں سے دوبارہ ملا ہوں جن سے دس برس پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔ تمام جنوب مشرقی افریقہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اس طرح ایک بار پھر میں نے دس برس پہلے کے کچھ لمحے جی لئے ہیں۔ کبھی کبھی گذرے ہوئے لمحوں میں دوبارہ جینا بڑا سکھ دایک لگتا ہے۔

جب میں تیار ہو کر اپنی نئی خریدی کار میں بیٹھ کر جواہر لال نہرو سٹیڈیم کے باہر پہنچا اور اپنی کار ایک طرف پارک کی تو پونے سات بجے تھے۔ ریس میں حصّہ لینے والے لوگ سٹیڈیم میں جمع ہو چکے تھے اور اپنے اپنے گروپس میں بٹ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ دِلّی شہر کے کسی کونے سے صبح کا سورج نکلا تھا۔ سورج تو ابھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں نے نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا اُسے، لیکن اُس کی پہلی سنہری کرنیں اشرفیوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ جنہیں رات کے بھکاری کونے کھدروں میں سے چُن رہے تھے۔

پہلا گروپ جسے جھنڈا لہرا کر دوڑنے کا اشارہ دیا گیا تھا چھوٹی عمر کے بچّوں کا تھا جو نکھرے ہوئے پُر عزم چہرے لئے "ریس ایگینسٹ ٹائم" میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے شاید اس بڑے مقصد کا واضح روپ تو نہیں تھا جس کے لئے وہ نیشنل سٹیڈیم تک یا پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے واپس جواہر لال نہرو سٹیڈیم میں آ جائیں گے۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس ریس میں شامل ہو کر وہ کئی اور ملکوں کے اپنے ہی جیسے بچّوں کی مدد کر رہے تھے۔ میں اپنے گروپ کے سامنے کھڑا تھا، جس کی دوڑنے کی باری چوتھے نمبر پر تھی۔ دہلی کے مختلف حصّوں سے آئے بنا کسی مذہب کی تفریق کے، بچّوں کی ایک ٹولی اسٹیڈیم سے باہر نکل رہی تھی۔ اُن کے شگفتہ اور معصوم ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ تھا۔ افریقہ کے بچّو! ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بیٹیوں کی اس صبح کو جب کہ اتوار تھا اور بچوں کو دیر تک سونا پسند ہوتا ہے، سیکڑوں بچّے آنکھ کھلتے ہی جواہر لال نہرو اسٹیڈیم میں آ گئے تھے۔ دھوپ کی پہلی کرنوں اور دِلّی کی کھلی سڑکوں پر "ریس ایگینسٹ ٹائم" میں حصّہ لینے کیلئے۔ پھر دوسرے گروپ کو جھنڈا لہرا کر دوڑ شروع کرنے کا اشارہ دیا گیا اور بڑی عمر کے بچے جن کے ہاتھوں میں سپورٹس ایڈ کے جھنڈے پکڑے ہوئے تھے۔ ایکدم شیروں کی طرح لپکے، جیسے اپنے شکار کو فوراً دبوچ لیں گے۔ لیکن ان کا شکار بہت مکار تھا جنگلی لومڑی کی طرح جب بھی

کسی نے تعاقب کیا۔ وہ صاف بچ کر نکل گیا ہمیشہ کی طرح۔ بھوک، جہالت، غریبی، بیماری یہی تو وہ شکار تھے جو صدیوں سے کسی کے قابو نہیں آ رہے تھے۔ لیکن تعاقب جاری تھا۔ تعاقب جاری رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تو شکار مارا ہی جائے گا۔

ابھی ہفتہ بھر پہلے پچھلے اتوار کو سوڈانی اولمپک چیمپین، عمر خلیفہ نے مشعل جلا کر، خرطوم کے ایک ریفیوجی کیمپ سے اپنی دوڑ کا آغاز کیا تھا۔ وقت کے خلاف دوڑ کا آغاز غربت اور بیماری کا پر عزم تعاقب۔ آج شام کو بارہ ملکوں کی راجدھانیوں میں سے دوڑتے ہوئے، نیویارک میں یونائیٹڈ نیشنز کے سکریٹری جنرل کے حوالے کرنے والا تھا عمر خلیفہ اپنی شعل، مختلف قوموں کے ہزاروں نمائندوں کے سامنے، جو اس بات کی گواہی دینے والے تھے کہ غربت اور بیماری کے خلاف لڑی جانے والی عظیم جنگ میں مذہب، نسل اور رنگ کا امتیاز کئے بغیر لاکھوں لوگ شرکت کریں گے۔

ہندوستان کے سترہ شہروں میں آج کے دن "ریس اگینسٹ ٹائم" تو محض ایک پرتیک تھا اسی عالمی گواہی کا۔ سورج کی پہلی کرنوں کی شعل کی روشنی میں، دہلی کے جواہر لال نہرو سٹیڈیم میں ہزاروں لوگ یہی گواہی دینے کیلئے جمع تھے۔ بچے، جوان، ادھیڑ عمر اور پکی عمر کے لوگ، وہ سب جو زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ بھی جو بالکل تھک گئے تھے لیکن تھکے قدموں سے اپنی دوڑ جاری رکھے ہوئے تھے۔ لمبی دوڑوں میں سبھی تو نہیں جیتتے، بہت سے تو ہار بھی جاتے ہیں۔

لیکن دوڑ تو جاری رہتی ہے۔

سنگھرش تو چلتا رہتا ہے۔

جھنڈے تو لہراتے رہتے ہیں۔

سورج کی روشنی میں منزلوں کے کنگارے تو چمکتے ہی رہتے ہیں!!

تیسرا گروپ بھی دوڑ میں شامل ہو گیا تھا۔ مائیک پر یہ اناؤنسمینٹ ہو رہی تھی کہ پہلا گروپ نیشنل اسٹیڈیم تک پہونچنے والا تھا۔ بچوں کی اس ٹولی کو ریسیو کرنے کے لئے اسٹیڈیم میں لوگ جمع تھے۔ بڑے بڑے اونچے مرتبوں والے لوگ، جو خود نہیں دوڑتے دوسروں کو دوڑاتے ہیں۔ ان کے گھوڑے دوڑتے ہیں ریس کورسوں میں۔ وہ خود دوربینیں لگائے اپنے اپنے گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں اور گھوڑوں کی ٹاپ کے ساتھ ان کے دل دھڑکتے اور بیٹھتے ہیں۔ ایسے کئی لوگوں نے تو "ریس اگینسٹ ٹائم" میں بھی ضرور اپنے گھوڑے دوڑائے ہوں گے۔

لیکن یہ دوسری بات ہے۔

جب آپ ایک بات کے بارے میں سوچتے ہیں تو کہیں سے کوئی دوسری بات بھی نکل آتی ہے۔

جب ہم افریقی ملکوں کی غربت اور وہاں پھیلے اکال اور بھکمری کے بارے میں سوچتے ہیں تو جانے

کیسے یہ خیال بھی آنے لگتا ہے کہ ہندوستان میں بھی تو گجرات، مہاراشٹر، راجستھان، آندھرا اور اُڑیسہ میں بھی قحط سالی ہے۔ بچے تو ان علاقوں میں بھی ہیں۔ بھوک تو انہیں بھی لگتی ہے۔ ایک راجستھان میں ہی ستائیس ہزار گاؤں قحط سالی سے متاثر ہیں۔ اور تو اور ہندوستان کے ہزاروں گاؤں میں صاف ستھرا محفوظ پینے کا پانی بھی تو میسر نہیں لوگوں کو۔ کیا افریقہ کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہیئے۔

جب ہم دنیا کے قحط اور بیماری اور بھکمری کے اندھیرے کو مٹانے کے لئے بہت بڑی بڑی مشعلیں جلاتے ہیں تو اپنے گھر کی دہلیز پر ایک مٹی کا دیا بھی تو جلا دینا چاہیئے۔

اس سے روشنی تو نہیں ہوگی۔

لیکن گھر کے اندر کا مہیب اندھیرا تو نظر آ ہی جائے گا۔ یہ بھی تو ضروری ہے۔

یہ ایک بات اور نکل آئی ہے۔

اس کے بارے میں پھر سوچیں گے۔

اس لمحہ تو میرے گروپ کو دوڑ شروع کرنے کا اشارہ مل گیا ہے۔ اور اس گروپ میں سب ادھیڑ عمر کے لوگ ہیں۔ ان میں سے بہت سے آدمی تو پچھلے ایک ہفتہ سے جوگنگ کرتے رہے ہیں، تا کہ ریس میں کچھ دیر دوڑ سکیں سڑکوں کا کچھ فاصلہ تو طے کر سکیں۔ میں بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میں نے بھی بلیو شیڈ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ ایسی ٹی شرٹس تو یونی سیف نے ہی تیار کروائی ہیں۔ میری شرٹ کے پیچھے بھی لکھا ہے۔ "آئی رن فار افریقہ"

میرے ادارے کے کچھ لوگ ___ جو میرے آگے ہیں ان کی ٹی شرٹس پر بھی یہی لائن لکھی ہے۔ ہم سب افریقہ کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ افریقہ بہت دور ہے۔ یہی پڑھ رکھا تھا میں نے سکول کی جغرافیئے کی کتاب میں۔ لیکن اب افریقہ کتنی نزدیک ہے۔

مانڈیلا کتنی قریب ہے۔

کینتھ کونڈا کتنا پاس ہے۔

نی ریری کتنا سمیپ ہے۔

بشپ ٹوٹو اور رابرٹ موگابے اور تامبو کتنی نزدیک ہیں۔

جتنے یہ لوگ اب ہمارے نزدیک ہیں۔ اتنے نزدیک تو ہمارے پڑوسی بھی نہیں۔

دِلّی میں میرے گھر کے ساتھ والے گھر میں رہنے والا ماتھر بھی میرے اتنا قریب نہیں جتنے کہ یہ لوگ ہیں۔

جواہر لال نہرو اسٹیڈیم سے باہر نکل کر میں کوئی ایک ہی کلومیٹر دوڑ پایا ہوں ابھی۔ دوسری سڑک سے تو پہلے گروپ کے بچے نیشنل سٹیڈیم سے ہو کر اور آئس کریم کھا کر واپس بھی آ رہے ہیں دوسری سڑک سے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جواہر لال نہرو اسٹیڈیم میں پہونچ جائینگے۔

جہاں اُدھیڑ مرتبوں والوں کا ایک گروہ ان کے سواگت کو کھڑا ہے۔ دراصل جب ہمارے والا گروپ

سٹیڈیم سے باہر نکل رہا تھا تو یہ اونچے لوگ چمکتی دھوپ میں سٹیڈیم کے اندر داخل ہو رہے تھے۔
میں اب تھکنے لگا ہوں۔ میرے قدم سُست پڑنے لگے ہیں۔ شاید اپنے گروپ کا میں آخری دوڑنے والا ہوں۔
دوسری سڑک سے پہلے گروپ کے بچے بھی واپسی پر کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ لیکن وہ سب سے آگے دوڑنے والا لڑکا کتنا چاک و چوبند ہے۔ کیسے مضبوطی سے قدم اُٹھا رہا ہے۔ وہ یقیناً اس "ریس ایگینسٹ ٹائم" میں فرسٹ آئے گا۔
میں دوڑتے دوڑتے رُک گیا ہوں۔
اور اس لڑکے کو دیکھ رہا ہوں۔
جو اب نیشنل سٹیڈیم میں داخل ہونے ہی والا ہے۔
اس کی ٹی شرٹ کی بیک پر بھی وہی لائن لکھی ہے، جو میری ٹی شرٹ کی بیک پر ہے۔
"آئی رین فار افریقہ"
اس وقت سوائے اس لائن کے میرے ذہن میں کوئی دوسری یا تیسری یا چوتھی بات نہیں۔
اس وقت شانتی ریبھال بھی میرے سامنے نہیں۔ جو شام کی فلائٹ سے دہلی پہونچ رہی ہے۔ ●●●

ڈبل شِفٹ

میری عمر اب چالیس سے اُوپر ہے اور میں تین بیٹوں کی ماں ہوں۔ میری بیٹی کوئی نہیں اور اس کی مجھے خوشی ہے ورنہ وہ بھی میری طرح زندگی کو شروع سے ہی ڈبل شِفٹ میں گذارنے لگتی۔ جس کا مجھے بے حد دُکھ ہوتا۔ اس لیئے کہ میں نے خود زندگی بھر ڈبل شِفٹ میں کام کیا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک، جب کہ میں خود ایک بھری پُری گرہستن ہوں۔

میری زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ بہت گھومی پھری بھی نہیں ہوں۔ گنتی کے یہی پانچ سات چھوٹے چھوٹے شہر دیکھے ہیں میں نے۔ بدیس کی بات تو چھوڑو میں نے اپنے ملک کے بمبئی، مدراس، کلکتہ جیسے بڑے بڑے شہروں کے نام بھی صرف اخباروں میں پڑھے ہیں۔ انھیں قریب سے جا کر نہیں دیکھا۔ دہلی میں صرف ایک ہی بار گئی تھی۔ وہ بھی شروع شروع میں جب میری شادی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں لوگ کیسے جیتے ہیں۔ خاص طور سے عورتیں۔ میری ہی طرح جیتی ہوں گی بیچاری۔ ان کی تقدیریں بھی تو اُسی نے لکھی ہوں گی جس نے ہم سب کی تقدیریں لکھی ہیں۔ اُس نے تقدیروں میں فرق کہاں رکھا ہوگا؟ وہ بڑا ہوشیار تقدیر ساز ہے۔

میں نے کبھی بہت سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے، اپنی زندگی کے بارے میں۔ نہ ہی کبھی زیادہ بات بھی کی ہے۔ جو زیادہ بولتے ہیں لوگ انھیں سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جو کم بولتے ہیں لوگ ان پر اعتبار نہیں کرتے۔ انھیں گھُنّے سمجھتے ہیں۔ اس لیے نہ تو زیادہ بولتی ہوں نہ بہت کم۔ صرف مطلب کی بات کرتی ہوں اور شاید یہی میری غلطی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ غیر تو کیا اکثر میرے اپنے لوگ، میرے سگے سمبندھی، میرا خاوند، میرے بچے، میرے کولیگز بھی میری بات نہیں سمجھتے حالانکہ بات مطلب کی ہوتی ہے۔ شاید ان کے مطلب کی نہیں ہوتی، اس لیے وہ غلط سمجھتے ہیں میری بات کو۔ یہی تو ہو رہا ہے پچھلے کئی دنوں سے میرے ساتھ۔

میرا بڑا لڑکا شرت پری انجینئرنگ کر رہا ہے۔ شرت اچھے قد کاٹھ والا ذہین لڑکا ہے اور مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ بڑا معصوم اور ایماندار قسم کا بچّہ ہے۔ پچھلے اتوار کپڑے دھونے لگی تو سینگروں سے اس کی پتلونیں اور بُش شرٹیں

اُتاریں۔ غسل خانے میں پھینکنے سے پہلے پتلونوں کی جیبیں دیکھنے لگی۔ ایک پتلون کی جیب میں سے تہ کیا ہوا پیڈ کا ایک کاغذ نکلا۔ کل شام ہی تو نیا پیڈ لایا تھا وہ۔ کاغذ کھولا۔ شرت کی ہی لکھاوٹ تھی۔ صاف صاف سیدھے الفاظ کے حرفوں کی گروز بالکل پوری۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ صاف اور سیدھے انداز سے لکھنے والے لوگ ایماندار اور پُرخلوص اور سچے ہوتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ شرت بڑا ایماندار لڑکا ہے۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اس نے مگر اس سمے وہ گھر پر نہیں تھا کسی دوست سے ملنے گیا تھا تھوڑی دیر پہلے میں اس کے کپڑے اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی اور وہیں غسل خانے کے باہر کھڑے ہو کر پیڈ کے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔

کل شام کی ہی تاریخ تھی خط پر۔ کسی لڑکی وندنا کو لکھا تھا اس نے خط۔ میں نے پڑھ کر خط الماری میں رکھ دیا۔ اور کپڑے دھونے لگی۔ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی میں۔ میں اس قسم کی اسٹیج سے نہیں گذری تھی۔ دسویں کی تھی کہ شادی ہو گئی تھی میری۔ کوئی مرد زندگی میں نہیں آیا تھا، سوائے اس کے جس سے سات پھیرے دلوا کر ماں باپ نے گھر سے بھجوا دیا تھا۔ اس لیے مجھے اپنے ہی گھر میں ہوئی اس واردات سے پریشانی ہوئی۔ شرت نے واپس آ کر اپنی پتلون تلاش کرنا شروع کی۔ پتلون ہینگر میں نہیں تھی۔ بڑا بوکھلایا ہوا تھا۔ بنا مجھ سے پوچھے غسل خانے میں پڑے کپڑوں کو اِدھر اُدھر پھینکنے لگا۔ کچھ دُھلے کچھ اَن دُھلے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ میں اسے پریشان دیکھ کر حیران نہیں ہو رہی تھی۔ صرف اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو شرت؟" میں نے پوچھا۔

"میری ایک پینٹ تھی"

"کون سی پینٹ؟"

"تھی ایک" اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا اور کپڑے دوبارہ اِدھر اُدھر پھینکنے لگا۔

"کپڑے کیوں خراب کر رہے ہو بیٹے؟"

"اپنی پینٹ تلاش کر رہا تھا" اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

"دو پتلونیں تو باہر تار پر ڈال دی ہیں"

میری بات سُن کر وہ فوراً صحن کی طرف لپکا اور تار پر ٹنگی بلیو شیڈ کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پتلون میں سے پانی نچوڑ رہا تھا وہ۔ میں غسل خانے سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ بے چارے کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

"ڈیم اِٹ" وہ چیخا۔

"کیا ہوا بیٹے؟"

"تم مجھ سے پوچھے بغیر کیوں میرے کپڑے الماری میں سے نکالتی ہو ممی؟"

"اس لیے کہ تم صاف کپڑے پہن سکو"

"آئی ڈونٹ لائک اِٹ" وہ بولا۔

"مجھے زیادہ انگریزی نہیں آتی۔ لیکن تمہاری باتیں مجھے بھی پسند نہیں۔"
میں نے غصے میں آکر آہستہ سے کہا۔
"ممی!" وہ چیخا۔
"میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے وہ تمہارا لو لیٹر۔"
شرت میرا جواب سن کر ایک دم بجھ گیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے نچڑنے لگا تھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔
"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔
"میری کلاس فیلو۔" اس نے بڑی ایمانداری سے جواب دیا۔
"کیا کرتا ہے اس کا فادر؟"
"انجینئر ہے۔"
"اور تمہارا باپ؟"
"ہیڈ کلرک۔"
"کہاں؟"
"اسی کے آفس میں۔"
"فرق سمجھتے ہو؟"
"لیکن ــــ"
"ایماندار آدمی کو اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔" میں یہ کہہ کر غسل خانے میں آگئی اور شرت صحن میں کھڑا سوچتا رہا۔ اس کا ہیڈ کلرک باپ اندر چارپائی پر لیٹا انگریزی اخباروں کے سنڈے ایڈیشن پڑھ رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ رات دیر سے گھر آیا تھا اور خوب پیے ہوئے تھا۔ اس کی یہ عادت اس کے اپنے بیٹے کو بھی پسند نہیں تھی۔ وہ بھی اپنی حیثیت کو نہیں سمجھتا تھا۔
کچھ ہی روز پہلے شرت نے بتایا تھا کہ اس کی کلاس کے سٹوڈینٹس سٹڈی ٹور پر جارہے تھے۔ بمبئی اور گوا سے ہو کر وہ دو دن دہلی میں رکیں گے۔ اس نے بھی اجازت چاہی تھی اور پانچ سو روپے بھی مانگے تھے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے بات کرے لیکن یہ کام بھی اس نے میرے ہی ذمے لگا یا تھا۔ شرت، آشش اور دیپتی جانے کیوں اپنی سبھی باتیں مجھ سے کہتے ہیں اپنے ڈیڈی سے نہیں۔ میں دفتر سے تھک ہار کر آتی ہوں۔ ان کے بستر ٹھیک کرنے سے لے کر انھیں رات کو پڑھنے کے لیے جگانے تک سبھی کام مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ ان کے ڈیڈی اپنے بیٹوں کے کسی بھی کام کے حصے دار نہیں۔ اس سے مجھے کبھی کبھی پریشانی بھی ہوتی ہے۔ اس دن سونے سے پہلے میں نے شرت کے ڈیڈی سے کہا۔
"شرت سٹڈی ٹور پر جانا چاہتا ہے۔"

"کہاں؟"

"بمبئی اور گوا"

"تم نے کبھی یہ جگہیں دیکھی ہیں؟"

"نہیں۔ آپ نے دیکھی ہیں؟"

"نہیں"

"اگر ہم نے کچھ نہیں دیکھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے بچے بھی کچھ نہ دیکھیں" میں نے کہا۔

"ضرور دکھاؤ۔ مجھے کیا تکلیف ہے"

"آپ کی اجازت تو ضروری ہے"

"تمہارے بیٹوں کو تو صرف تمہاری اجازت چاہیے۔ میری کیا پرواہ کرتے ہیں وہ"

"آپ کتنی پرواہ کرتے ہیں ان کی۔ کبھی سوچا بھی ہے آپ نے اپنے بیٹوں کے بارے میں"؟

"وہ آنچل تو تمہارا پکڑے رکھتے ہیں ہر وقت"

"آپ اپنی پتلون کا پائینچہ پکڑا دیجئے"

"بہت لمبی زبان ہو گئی ہے تمہاری"

"کیونکہ میں صرف مطلب کی بات کرتی ہوں"

"اور تو سبھی بکواس کرتے رہتے ہیں نا"؟

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ شرت کو جانے کے لیے کہہ دوں کہ نہیں؟"

"اسے کچھ رقم بھی تو چاہیے ہوگی"

"پانچ سو روپے مانگتا ہے"

"میرے پاس تو پانچ روپے بھی نہیں"

میرا من چاہا کہوں شراب کے لیے تو روپے آجاتے تھے کہیں نا کہیں سے لیکن اپنے بچوں کی کوئی مانگ پوری کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا ان کے پاس۔ لیکن میں نے اس لیے بات کو نہ بڑھایا کہ بیکار کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ اس لیے بات کو ختم کرنے کے خیال سے کہا۔

"میں جو ڈبل شفٹ لگاتی رہی ہوں آفس میں اس کے پانچ سو روپے ملیں گے وہی شرت کو دے دوں گی"

"وہ کیسے دے دو گی شرت کو؟"

"اور کیا کروں؟"

"اس رقم سے تو ہاؤسنگ بورڈ کے مکان کی قسط دی جائے گی"

"اس رقم سے کیوں دی جائے گی؟"

"اس لیے کہ تمہارے سورگیہ پتا لالہ دینا ناتھ جی میرے نام کوئی اور رقم نہیں لکھ گئے ہیں۔ بس یہ ڈبل شفٹ والی رقم ہی تو ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے سگریٹ سلگائی اور دھوئیں کا ڈھیر سارا دھواں میری طرف پھینک دیا نشے کا بوجھ ابھی دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

"کون پلاتا ہے ہر روز آپ کو جو آپ کبھی ہوش میں نہیں ہوتے؟"

"تمہارا اپنا سورگیہ لالہ دینا ناتھ۔" انھوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"شرم آنی چاہیئے آپ کو۔" میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور انھوں نے مجھے پیٹنے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں بستر سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"ٹھہر کمینی۔" وہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا گئے۔

میں دروازے سے باہر نکل آئی۔ دوسرے کمرے کی روشنی بھی بجھی ہوئی تھی بچے سو چکے تھے۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ میں جب بھی کبھی کسی معاملے پر بات کرتی ہمارا جھگڑا ہو جاتا۔ شروع شروع میں تو بچوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن اب وہ اپنے ڈیڈی کی عادت جان گئے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف ذرا سی بھی بات کہوں تو وہ جھگڑے پر اُتر آتے۔ یہ ان کا حق تھا کہ بنا مجھ سے پوچھے میری الماری سے رقم اُٹھالیں یا پرس سے پیسے نکال لیں اور میں اگر کبھی پوچھ بیٹھوں تو مرنے مارنے پر تیار۔ اب ان کی یہ بات بچوں کو بھی ناگوار گذرنے لگی تھی۔

لیکن اس رات انھوں نے بار بار میرے پتا جی کا ذکر کر کے میری بڑی بے عزتی کی تھی۔ میں اگر خاموشی سے کمرے سے باہر نہ نکل آتی تو وہ آدھی رات کو ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور سارا محلہ جاگ جاتا۔ میں چپ چاپ چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں آگئی اور کُشن کو سر کے نیچے رکھ کر صوفے پر ہی لیٹ گئی۔ جانے کیوں مجھے آج اپنی ماں اور اپنے پتا بہت یاد آنے لگے۔ کچھ شیریں اور ترش یادوں کی پرچھائیاں میرے ذہن میں اُبھرنے لگیں۔

ماں بہت بیمار ہے اس کے بچنے کی اُمید کم ہے۔

میں سب سے بڑی لڑکی ہوں۔ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن ہے۔ ان کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں۔ میری عمر بھی زیادہ نہیں لیکن گھر کو سنبھالنا میرا ہی کام ہے۔ مجھے اپنے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے۔ پتا جی بہت پریشان ہیں۔ ہمارے مالی حالات بہت اچھے نہیں۔ ایک اسکول ماسٹر کے مالی حالات اچھے ہو بھی کیا سکتے ہیں۔ اسکول کا کام، حکیموں اور ڈاکٹروں کے چکر۔ ان کی اپنی صحت بھی تو بہت اچھی نہیں۔ گھر بھی دیکھتی ہوں، ماں کو بھی سنبھالتی ہوں اور بہن بھائیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہوں۔ محلے والے بھی ترس کھاتے ہیں میری حالت پر۔ اور پھر ایک دن ماں ہم سب کو چھوڑ جاتی ہے۔ ایک بھونچال ہی تو آگیا ہے گھر میں۔ سب کچھ ڈھ گیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔ ہمارے ڈھانچے ضرور بچ گئے ہیں ورنہ زندگی کی نیو ہل گئی ہے۔

پتا جی ہر دوار گئے ہیں۔ اور ہم چار یتیم بہن بھائی گھر میں دہاڑیں مار رہے ہیں۔ گلی محلے کی عورتیں سنبھال رہی ہیں سب کو۔ وہ جب کبھی آپس میں بات کرتی ہیں تو میرا کلیجہ ہل جاتا ہے۔

"گھر اجڑ گیا ماسٹر جی کا۔"

"کیا ہیرا عورت تھی سُکھ ونتی۔"

"کون سنبھالے گا ان یتیموں کو۔"

"بڑی لڑکی کی جُون خراب ہو گئی۔"

میری تو واقعی جُون خراب ہو گئی تھی۔ بچپن میں ہی کولہو میں جُت گئی۔

زندگی کا پہلا سبق ملا کہ بے غرض ہو کر اپنا آپ قربان کر دو دوسروں کے لیے میں دیتی رہی اپنی قربانی۔

وقت گذرتا گیا۔

پتا جی کی عمر بھی بڑھنے لگی اور ہم سب کی بھی۔ ہم سب اسکول جاتے تھے اور گھر کا کام بھی کرتے تھے پتا جی کا بستر بچھانے سے لے کر گھر میں جھاڑو دینے کا کام میرے ذمے تھا۔ بہن بھائی بھی مدد کرتے تھے لیکن ساری ذمہ داری میری ہی تھی۔ زندگی کئی شغلوں میں بٹ گئی تھی۔

اِدھر میں نے دسویں پاس کی اُدھر پتا جی نے میرا بیاہ کر دیا۔ میں نے بہت روکا۔

"گھر نہیں چلے گا پتا جی آپ سے۔"

"گھر بھگوان چلائے گا بیٹی۔ تو جا۔"

"میرے بہن بھائی رُل جائیں گے۔"

"بھگوان راکھا ہے سب کا۔"

بھگوان پر اتنا اٹوٹ وشواس کہ کوئی توڑ ہی نہیں۔ پتا جی کی سیکھ پلے باندھ کر لوٹلی سی بنی گھر کی دہلیز پار کر کے چلی آئی پردیس میں۔

پھر لمحوں کی بوچھاڑ دھاڑم دھاڑ

سب کچھ بہہ گیا

دھیرے دھیرے یادداشت بھی مٹنے لگی۔

گھٹنوں گھٹنوں گارا۔ پاؤں نکالنے کی کوشش کروں تو اور نیچے کو دھنستی جاؤں۔ اور پھر لگا جیسے سب کچھ دُھل گیا تھا ذہن سے۔ ماں باپ کا گھر جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ جیسے میں کبھی بچی تھی ہی نہیں ایسی کی ایسی پیدا ہوئی تھی گویا محنت مشقت کے ہاتھوں پالی گئی تھی۔

سسرال والوں کا گھر۔

ایک پرائی لڑکی کو پال لیا تھا بڑے پیار سے۔

ماں کی کمی پوری ہوگئی پتا جی کی نہیں۔ یہاں بھی بھائی بہنوں کی بھرمار تھی۔ لگتا ہے غریب گھروں میں بچے جنگلی پودوں کی طرح اُگتے ہیں کسی کا بھی تو قابو نہیں اُن پر۔ عورتیں بے حیائی سے پیٹوں کے ڈھول اُٹھائے پھرتی ہیں' گلی گلی بہت بُرا لگا شروع میں۔

اور پھر ایک دن اپنا پیٹ بھی ڈھول بن گیا جسے چھپائے چھپائے پھرتی۔ ادھر میرا پہلوٹھی کا لڑکا شرت پیدا ہوا ادھر میری ساس چل بسی۔ بڑی منحوس بہو تھی اولاد بھی ایسی جنی کہ گھر کی مالکن ہی چلتی بنی۔

"صرف نام کی بھاگونتی ہے"

"لچھن تو بھاگ جلی کے ہیں"

"مرنے والی نے سب کچھ لڑ کر یں ڈھک رکھا تھا"

"سب کچھ بکھر جائے گا اب"

بیٹے کو چھاتی سے لگائے گھر کی دیواروں کے ساتھ لگی سُن رہی تھی کانوں کو چیرتی ہوئی تیروں جیسی یہ آوازیں۔

نئے شہر میں لے آیا تھا بجھے میرا آدمی اور دفتر میں بھرتی کرا دیا تھا۔ یہ زندگی گذارنے کا نیا تجربہ تھا۔

میرے دفتر میں ہی کام کرنے والی تین چار عورتوں نے ایک بڑھیا کو ان کے بچوں کی دیکھ بھال کا کام سونپ رکھا تھا۔ میرا بیٹا بھی اسی گروپ میں شامل کر دیا گیا۔ دن بھر اس پر کیا بیتتی مجھے کیا پتہ شام کو دفتر سے جاکر اسے سمیٹتی اور گھر پہونچ جاتی۔ شرت بے چارا تو پلا بھی ڈبل شفٹ میں۔ پہلی شفٹ تو دفتر کی بھینٹ ہو جاتی تھی۔ بچہ تو اوور ٹائم میں پل رہا تھا۔ من کو بہت مارنا پڑا۔ تھوڑے سے پیسوں کے موہ میں گھر چوپٹ ہو گیا تھا۔

"مجھ سے نہیں نبھے گا یہ سب کچھ" میں نے ایک دن شرت کے ڈیڈی سے کہا۔

"تو چھوڑ دو لیکن میں گھر چلانے کے لئے ایک پیسہ نہیں دوں گا"

"کون دے گا؟"

"مجھے معلوم نہیں"

تکرار کرنے کا رواج نہیں تھا اس گھر میں جہاں سے میں آئی تھی۔ اس لیے میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور یوں تکرار نہ کرنے کی عادت مجھے توڑتی گئی اندر ہی اندر سے۔ مجھے ریزہ ریزہ کرنے میں میرے تھوڑے وقفوں کے بعد بچے پیدا ہوئے میرے تینوں بیٹوں کا بھی حصّہ تھا۔ شرت کے بعد آشش اور اس کے بعد وِکی اور پھر میں نے روکنا چاہا ان کے ڈیڈی کو' گھر میں اور بھیڑ نہ جمع کرنے کے لیے اور وہ بے قابو ہو گئے۔

"تو آپریشن کروا لو مجھے ہی کیوں روکتی ہو"

"آپ کروا لو نا آپریشن"

"میں تو نہیں کراؤں گا"

"کیوں؟"

"میری مرضی۔"

"تو میں اپنے پنڈے کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔"

"یہ بھی کر دیکھنا۔"

"آخر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ آپریشن بھی میں نے ہی کرایا۔ ڈر تھا پتی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بے چاری عورتوں کو کتنے محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے۔ سماج نے انھیں شکست دینے کیلئے سینکڑوں محاذ کھول رکھے ہیں۔ کہیں تو آخر ہارے گی ہی عورت۔ کب تک لڑے گی بِنا ہتھیاروں کے۔ عورتوں کو ہتھیار رکھنے کے بھی تو لائسنس نہیں ملتے۔ کہاں تک حفاظت کر سکتی ہے اپنے جان و مال کی۔ ایک طرف دشمنوں کی ہتھیار بند فوج اور دوسری طرف ایک اکیلی ناری۔ بے چاری ستی تو ہو سکتی ہے لڑ نہیں سکتی۔

مجھے لگتا ہے کہ دُنیا کی ہر عورت ڈبل شفٹ میں ہی کام کرتی ہے۔ چاہے وہ ڈیویلپڈ ملک کی رہنے والی ہو چاہے انڈر ڈیویلپڈ ملک کی۔ ہر عورت کی تقدیر یہی ہے کہ وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر مرنے تک اپنی بھاؤناؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسروں کو زندہ رکھنے کے لئے ڈبل شفٹ میں بلکہ ملٹی شفٹ میں کام کرے۔ زندگی بھر کی اس کڑی ریاضت کا صلہ ہے وہ کھوٹی دھات کا تمغہ جو جنم لیتے ہی اس کے گلے میں لا ڈال دیا جاتا ہے اور جس پر زندگی بھر مبہم اور ذو معنی عبارتیں تحریر کی جاتی ہیں اور ان تحریروں کو نقش کرنے والوں میں اس کے اپنے خاندان کے لوگوں سے لے کر دُنیا بھر کے دانشور شامل ہیں۔ ان تمام تحریروں کے معنی ایک ہی ہیں۔ عورت چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں کسی بھی رُوپ میں زندہ ہے فقط دوسرے درجے کی شہری ہے کیونکہ ڈبل شفٹ میں کام کرنے والے لوگ اعلیٰ درجے کے شہریوں میں شمار نہیں ہو سکتے۔

پچھلے دو مہینوں سے دفتر میں بہت کام ہے۔

جانے کہاں کہاں سے پُرانے ریکارڈ چیک کیے جا رہے ہیں۔ شام کو روز ہی دیر سے گھر آتی ہوں۔ میرے چہرے پر تو نحوست چھپی ہوئی ہے۔ مجھے تو خیر اوور ٹائم کرنا پڑتا ہے اور ڈبل شفٹ لگانا پڑتی ہے۔ لیکن شرت کے ڈیڈی دن بھر دفتر میں سوائے سگریٹ اور چائے پینے کے کچھ نہیں کرتے اور پھر بھی ہر روز دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔ ہوش و حواس گنوائے ہوئے۔ کئی برسوں سے ہیڈ کلرک ہیں پروموشن نہیں ہوا۔ سالانہ رپورٹیں خراب ہیں۔

ایک نیا جھنجھٹ مُول لیا ہے کئی مہینوں سے۔ ہاؤسنگ بورڈ کا ایک بنا بنایا فلیٹ لے لیا ہے ہیڈ کلرک صاحب نے۔ فلیٹ ان کے نام ہے، قسطیں بھرنے کا کام میرے ذمے۔ ایک اچھی خاصی رقم تو شروع میں ہی جمع کرا دی۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب لے گئے۔ اب میری بینک بُک بھی انھیں کے پاس رکھی ہے۔ جس میں کُل ایک سو تین روپے پچپن پیسے باقی رہ گئے ہیں۔ یہ میری زندگی کی ساری کمائی ہے اور شرت خط لکھ رہا ہے ان کے پاس کی لڑکی کو۔ مُورکھ ماں کا مُورکھ بیٹا۔ خالی بینک بُکوں پر لَو لیٹرز لکھ کر بیٹھے، قیمتی پیڈ کے خوب صورت کاغذوں کا کیوں ناس مار رہا ہے۔ ایک طرف فلیٹ کی قسط جمع کرانے کا نوٹس ہے۔ اور دوسری طرف

شرت کے سٹڈی ٹُور پر جانے کا تقاضا۔

رات بھر سر کو کُشن پر رکھے اور صوفے پر ٹانگیں جوڑ کر لیٹے میری بند آنکھوں کے سامنے قسط جمع کرانے کا نوٹس اور وندنا کے نام شرت کا لکھا ہوا خط، دونوں پھڑ پھڑاتے رہے، جیسے بہت سخت جھکڑ میں کاغذ کے یہ پنّے ایک دوسرے سے اُلجھ کر میری آنکھوں سے ٹکرا رہے ہوں۔ کاغذوں کی یہ مار کھاتی رہی اپنے چہرے اور اپنی آنکھوں پر رات بھر اور پھر نڈھال ہو کر جانے کیسے اور کب سو گئی۔ کمزور اور ہارے ہوئے لوگوں کی آخری پناہ نیند کی خندق ہی تو ہوتی ہے۔

صبح بہت جلد جاگ گئی۔

یہی ہوتا ہے اکثر میرے ساتھ۔ رات کو دیر تک جاگتی ہوں تو صبح اور بھی جلدی اُٹھ جاتی ہوں۔ جی بھر کر پانی گرایا اپنے ٹھنڈے پر نہانے سے دماغ پر پڑا بوجھ بھی ڈھل گیا۔ بوجھ تھا بھی تو بہت!

کچن میں جا کر چائے بنائی اور چائے کی پیالی لے کر بچّوں کے کمرے میں آ گئی۔ شرت بس جاگا ہی تھا ابھی ابھی، آشِش اور رِوِگی سو رہے تھے۔ کتنے پیارے لگ رہے تھے اس طرح سوتے ہوئے۔ میں نے چائے کی پیالی شرت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو چائے۔"

"آئی ایم سوری ممّی۔" اس نے اچانک چونک کر کہا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ چائے کی پیالی لیتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"تم سٹڈی ٹُور پر صرف بمبئی اور گوا دیکھنے کے لیے جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔"

"اور کس لیے؟"

"وندنا جا رہی ہے اس لیے۔" کتنی ایمانداری سے بول پڑا تھا میرا بیٹا۔

"سٹیٹس کے فرق کا خیال کیا ہے تم نے؟"

"ابھی نہیں۔"

اس کے جواب کے بعد میں پل بھر خاموش رہی۔ اتنے بڑے سماجی فرق کا احساس اسے میرے کہنے سے نہیں ہوگا۔ تجربے سے ہی ہوگا۔ تکرار فضول تھی۔

"تو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تھینکس ممی۔"

"پانچ سو روپے مجھ سے لے لینا۔"

مجھے لگا صرف اس کی آنکھیں ہی نہیں بھری پڑی تھیں گلا بھی بھر گیا تھا۔ وہ بول نہیں سکا ایک شبد بھی۔ صرف اپنا سر گھماتا رہا۔

جیسے بار بار شکریہ ادا کر رہا ہو میرا۔

میں کمرے سے باہر نکلنے کو ہوئی تو شرت نے ایک بار آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی لرز رہی تھی۔ اسی سمے اس کی چھلکتی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ہی بار ٹپ ٹپ کر کے چائے کی پیالی میں گر گئے۔

"میں دوسری پیالی لاتی ہوں تمہارے لیے"، میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"آج چائے نہیں ملے گی کیا؟"

شرت کے ڈیڈی کی آواز آ رہی تھی بیڈ روم سے۔ رات کا نشہ ٹوٹ رہا تھا شاید۔

غلام نبی

آج جانے کیوں مجھے غلام نبی کی یاد آ رہی ہے۔

غلام نبی پرنس آف ویلز کالج جموں میں میرا کلاس فیلو تھا۔

میری اُس سے دوستی اُسی دن شروع ہو گئی تھی جب میں اُس سے پہلی بار ملا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ کالج میں داخلہ لینے آیا تھا۔ اُس کے باپ کا قد چھ فٹ سے بھی لمبا تھا اور اُس نے سفید شلوار کے ساتھ کالے رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی اور سر پر شملے دار ریشمی لنگی باندھی ہوئی تھی۔ غلام نبی اُس کے ساتھ چلتا ہوا اپنے باپ کی تیس برس پہلے کی تصویر نظر آتا تھا۔ جتنا حسین غلام نبی اُس سمے لگ رہا تھا اُس کا باپ بھی اُس عمر میں اتنا ہی حسین رہا ہو گا۔ میں دیر تک باپ اور بیٹے کو سُرخ پتھر کے بنے کالج کے برآمدے میں کھڑا دیکھتا رہا اور پھر اُن کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا پرنسپل کے دفتر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ غلام نبی کا باپ رُک گیا تھا۔ کئی لڑکے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ میں جان بوجھ کر اُن کے قریب سے گزرا۔ وہی بات ہوئی جس کا مجھے اندازہ تھا۔ غلام نبی کے باپ نے مجھے روک کر پوچھا۔

"پرنسپل صاحب کا دفتر کہاں ہے؟"

"وہ رہا، جس کمرے پر چق پڑی ہے" میں نے جواب دیا۔ کتنا وقار تھا اُس شخص کی شخصیت میں۔

"تم کس کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"جی سیکنڈ ایئر میں"

"یہ میرا لڑکا غلام نبی ہے اُسے فرسٹ ایئر میں داخل ہونا ہے"

میں نے غلام نبی سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے ہاتھ کتنے مُلائم تھے۔ مجھے ایک دم اِندرا گوسوامی کے ہاتھ یاد آ گئے۔ اِندرا گوسوامی میرے محلّے کی لڑکی تھی جس سے اُن دنوں میرا رومانس چل رہا تھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم وادیٔ لولاب کے رہنے والے ہیں۔ میں وہاں کا جاگیردار ہوں۔ غلام نبی پہلی بار اپنے علاقے سے باہر آیا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

"میں جموں ہی میں رہتا ہوں۔ جولاہکہ محلہ میں۔ کالج سے کوئی پانچ میل کا فاصلہ ہے۔"

"کیسے آتے ہو تم کالج؟" غلام نبی نے پوچھا۔

"پیدل۔"

"اتنی دور سے پیدل آتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"میں کسی جاگیردار کا بیٹا نہیں، ایک غریب آدمی کا لڑکا ہوں۔"

"غلام نبی سمجھتا ہے کہ پیدل چلا ہی نہیں جاسکتا۔ ہر وقت بگھی کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"یہاں تو بگھی بھی نہیں چل سکتی۔ سارا شہر پہاڑی پر آباد ہے۔"

"سُن لیا برخوردار۔" اُنھوں نے غلام نبی سے کہا اور غلام نبی کے گورے گالوں پر ایک دم سُرخی کی تہیں پھیل گئیں۔

پھر غلام نبی اپنے باپ کے ساتھ پرنسپل کے کمرے میں چلا گیا اور جب داخلے کی فیس وغیرہ دینے اور داخلے کا فارم بھرنے کے لئے دفتر میں گیا تو میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔

غلام نبی اور اُس کے والد ریزی ڈینسی روڈ پر واقع ایک مُسلم ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کالج سے واپسی پر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے اور اُس روز میں نے پہلی بار اُس ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔

اُس سے اگلے روز غلام نبی کا جاگیردار باپ وادیٔ لولاب میں واپس چلا گیا اور میری اور غلام نبی کی دوستی پکی ہوگئی۔ میں اسے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں لے آیا اور غلام نبی اپنے آپ کو ایک دم اکیلا محسوس کرکے بے حد اداس ہوگیا۔ اُس کے باپ کے سٹیٹس کا خیال کرتے ہوئے پرنسپل نے اُسے سنگل روم دے دیا تھا۔

"تم آج یہیں رہ جاؤ۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔"

"آہستہ آہستہ جان جاؤ گے۔"

"لیکن مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا۔ تم مت جاؤ۔"

"مجھے اپنے گھر اطلاع دینی ہوگی۔"

"تو دے آؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"آج تم میرے ہی گھر رُک جانا۔ کل میں تمہارے پاس رُک جاؤں گا۔" اُس نے میری تجویز مان لی تھی لیکن بورڈنگ ہاؤس کے پارسی سپرنٹنڈنٹ نے انکار کردیا تھا۔

چناں چہ غلام نبی اُس دن میرے ساتھ میرے گھر آیا تھا۔

گمٹ کی ڈھکی کی سیڑھیاں چڑھتے ہی وہ ہانپنے لگا تھا۔

"ابھی کتنی دُور ہے تمہارا گھر؟"

"چار میل دُور۔"

غلام نبی نے میرا جواب سُن کر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"تو تم کالج واپس چلے جاؤ۔ میں اپنے گھر اطلاع دے کر شام تک آ جاؤں گا۔"

"نہیں تم نہیں آؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" اُس نے بڑے سہمے انداز سے میری طرف دیکھا۔

"تو چلو۔"

غلام نبی میرے ساتھ گھسٹتا ہوا سا چلنے لگا اور جب ہم گھر پہنچے تو مجھے لگا اب وہ واپس بورڈنگ ہاؤس نہ جا سکے گا۔ وہ تھکن سے ایک دَم ٹوٹ چکا تھا۔

غلام نبی میری ماں سے ملا اور رو پڑا۔

"کیوں کیا ہوا غلام نبی؟"

"مجھے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔" اُس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا اور میری ماں نے شفقت بھرا ہاتھ غلام نبی کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہاری ماں ہوں۔"

اور غلام نبی نے تشکر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کے گالوں پر ایک بار پھر سُرخی کی لہریں دوڑ گئیں۔

جبھی اِندرا گوسوامی بھی آ گئی تھی۔

"یہ میرا نیا دوست ہے غلام نبی۔ اُس کے ہاتھ بالکل تمہارے ہاتھوں کی طرح نرم ہیں۔"

میری یہ بات سُن کر وہ شرما گئی اور بولی۔

"تم اپنی بات کہنے سے پہلے سوچا کیوں نہیں کرتے؟"

"جب سوچنا شروع کروں گا تو اپنی بات نہیں کہہ سکوں گا۔"

غلام نبی نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا اور میرے اور اِندرا گوسوامی کے رشتے کے بارے میں سوچنے لگا۔ شاید اُس نے ایسے رِشتے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اور اُس رات جب میں بورڈنگ ہاؤس میں اُس کے ساتھ ہی اُس کے کمرے میں ٹھہر گیا تو وہ بہت دیر تک جاگتا رہا اور اپنے باپ اور اپنی ماں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اُس کے جاگیردار باپ نے چار شادیاں کر رکھی تھیں اور غلام نبی اُس کی سب سے چھوٹی بیگم سے تھا۔ اُس کے چار سوتیلے بھائی تھے جو اُسے بہت ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ اُن سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اُس نے وادیٔ لولاب کے حسین اور خوبصورت مناظر کی باتیں کیں اور بتایا کہ کُونجوں کی لمبی لمبی قطاریں وادی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک آسمان کی وُسعتوں میں اُڑانیں بھرتی

تھیں اور وادی کے ایک بہت ہی خوبصورت حصّے میں اُس کی بہت ہی پیاری اور خوبصورت ماں ایک چھوٹے سے کچّے گھر میں رہتی تھی جس کے اِرد گرد پھولوں کے بے شمار پودے تھے اور چیل کے درخت تھے اور قریب ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی جس کے پانی میں سے چھوٹے چھوٹے گول پتھر موتیوں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔

غلام نبی میرا بہت ہی عزیز دوست بن گیا۔

اُس کی دوستی گہری اور سے ہو ہی نہ سکی۔

"بورڈنگ ہاؤس کے سب لڑکے بدمعاش ہیں" اُس نے ایک دن کہا تھا۔

"کیوں؟"

"ہر وقت گندے گندے مذاق کرتے ہیں"

غلام نبی بڑے لطیف جذبوں کا مالک اور بڑی نازک طبیعت والا لڑکا تھا۔ اِس لئے اُسے کوئی بھی بوجھل یا کرخت چیز یا شخصیت پسند نہ تھی۔ اِس لئے اُسے میں پسند تھا اور میری ماں پسند تھی اور میری دوست اِندراگوسوامی پسند تھی۔

غلام نبی ہر روز کالج کے بعد مجھے گمٹ کی ڈھکّی کے گیٹ تک چھوڑنے آتا تھا۔ یہ ایک میل کا سفر تھا۔ میری کُل مسافت کا پانچواں حصّہ۔ اور وہ ہر روز میرے پاس ایک میل کے سفر کا شریک تھا۔ سردی گرمی، دُھوپ چھاؤں، شام صبح، اُس کے لئے وقت کی کوئی تشخیص نہیں تھی۔ میں آج بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں ایسے کتنے لوگ ہمیں زندگی میں مل سکتے ہیں جو اس شدّت سے ہمارا ساتھ دے سکیں۔ ایک بار جب اِندراگوسوامی سے میرا جھگڑا ہو گیا تو غلام نبی نے ہی ہماری صُلح کرائی تھی۔ صُلح کراتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"اِندرا میں تمہیں اُن ہاتھوں کی قسم دیتا ہوں جن کی وجہ سے تمہارا دوست میرے ہاتھوں کی بھی قدر کرتا ہے۔ تم اُس سے جھگڑا کرو گی تو تمہارے ہاتھوں کی تمام خوبصورتی ختم ہو جائے گی"

"تمہارا ابھی دماغ خراب ہے غلام نبی"

"ہاں جبھی تو تمہیں تمہارے خوبصورت ہاتھوں کی قسم دلا رہا ہوں ورنہ تمہیں خُدا کی قسم دلاتا جس کے وجود کا مجھے یقین نہیں"

"تم خُدا پر یقین نہیں رکھتے"

"نہیں۔ میں صرف حُسن کی عظمت پر یقین رکھتا ہوں"

"اور کس پر یقین ہے تمہیں؟"

"اپنے دوست کی دوستی پر"

اور اُس شام اِندراگوسوامی نے میرے ساتھ صُلح کر لی اور میرا اور اُس کا جھگڑا ختم ہو گیا۔

ایسا تھا غلام نبی۔

ایک دن صبح سویرے کلاس میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا غلام نبی بے حد پریشان اور اُداس لگ رہا تھا۔ لیکن

اُس کے چہرے کی اُداسی نے اُسے اور بھی پُرکشش بنا ڈالا تھا۔

"تم آج بڑے پیارے لگ رہے ہو غلام نبی۔"

"مذاق کرتے ہو یار۔"

"نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین نہیں تو اگلے بینچوں پر بیٹھی کسی لڑکی سے پُوچھ لو۔"

میرے اِس طرح کے ریمارکس پر غلام نبی اکثر قہقہہ لگایا کرتا تھا لیکن اُس دن اُس نے ہنسنے کی بجائے بڑی درد بھری آواز میں کہا۔

"اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

"وادیٔ لولاب میں تمہارے خوبصورت گھر کے قریب ایک نہایت ہی خوبصورت قبر بنواؤں گا اور اُس کے کتبے پر لکھوں گا:

"یہاں ایک خوبصورت خواب سویا پڑا ہے۔ اُسے کوئی مت جگائے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے غلام نبی؟"

"مجھے بُری طرح محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے نبی کا غلام نہیں ہوں بلکہ اُن انسانوں اور اُن کی تخلیق کی ہوئی بیہودہ روایات کا غلام ہوں جو خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ مجھے یہ غلامی برداشت نہیں۔"

بس اتنی بات کہہ کر غلام نبی بغیر اجازت حاصل کئے کلاس سے باہر نکل گیا تھا اور اُس کے بعد دن بھر مجھے نہیں ملا تھا اور اُس شام وہ میرے پانچ میل کے سفر کے پانچویں حصے میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اُس روز میں گمٹ کی ڈھکی تک اکیلا ہی آیا تھا اور وہ سیڑھیاں بھی میں نے اکیلے ہی چڑھی تھیں اور اُس گیٹ پر بھی اکیلا ہی پہنچا تھا جس کے اندر رلو گزرے پیر کا مزار تھا جس پر ہمیشہ سبز چادر چڑھی رہتی تھی اور جہاں پر جمعرات کو لوگ منتیں ماننے آیا کرتے تھے۔

اُس روز غلام نبی میرے ساتھ نہیں تھا۔ اُسے اپنے باپ کا کوئی خط ملا تھا جس نے اُسے ایک دم برہم اور بے حال کر ڈالا تھا۔

اگلے روز جب میں کالج پہنچا تو کہرام مچا ہوا تھا۔

غلام نبی نے رات خودکشی کر لی تھی اور اُس کی لاش اُس کے کمرے میں پڑی تھی اور پولیس بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے اسٹوڈینٹس اور بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ سے پُوچھ تاچھ کر رہی تھی۔ پولیس میرا بیان بھی لینا چاہتی تھی کیونکہ سب نے پولیس کو یہی بتایا تھا کہ میں غلام نبی کا بہت ہی قریبی دوست تھا۔ میں نے جب اُس کی اپنی ہی سلک کی چادر سے ڈھکے ہوئے چہرے سے چادر ہٹائی اور اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ مجھے اتنا معصوم، اتنا خوبصورت اور اتنا پیارا لگا کہ میں نے اُس کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

غلام نبی کے والد کو تار دے دیا گیا تھا لیکن اُن کے گاؤں میں تار گھر نہیں تھا۔ اُسے تین چار روز کے بعد ہی اطلاع مل سکتی تھی۔ دو دِن تو اُسے لولاب سے جموں پہنچنے میں ہی لگ جائیں گے۔ ایک ہفتہ سے پہلے اُس کے گھر سے کوئی نہ آ سکے گا۔ چنانچہ یہی طے ہوا کہ اُس کی لاش کو دفنا دیا جائے۔

پولیس کی پُوچھ تا چھ، لاش کا پوسٹ مارٹم اور دفنانے کا انتظام۔ اِن سب معاملوں سے نپٹ کر جب غلام نبی کی لاش کو ریزی ڈینسی روڈ سے گزر کر دریائے توی کے کنارے، پہاڑی کے پھیلاؤ میں سمٹے ہوئے قبرستان میں لایا گیا تو شام ہو چکی تھی۔ کالج کا تمام اسٹاف موجود تھا۔ میں کونے میں خاموش کھڑا اپنے پیارے دوست کو قبر میں اُتارتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب فاتحہ پڑھنے کے ساتھ غلام نبی کی لاش کو قبرستان کی مٹی کے سپرد کیا گیا تو میں ایک دم پھوٹ پڑا۔ اُس شام جب اندرا گو سوامی ہمارے گھر آئی تو وہ بھی زار و قطار روتی رہی۔ اب اُسے اُس کے خوبصورت ہاتھوں کی قسمیں کون دلایا کرے گا۔

غلام نبی جو میری روزانہ مسافت کا مستقل ساتھی تھا مجھے اچانک چھوڑ کر خود ایک طویل سفر پر چلا گیا تھا۔ اور میں اُس کے ساتھ ایک قدم بھی نہ چل سکا تھا۔ غلام نبی کا خوبصورت چہرہ دیکھتے ہی میں کھِل اُٹھتا تھا اور اس کے لمبے لمبے کالے بالوں میں نکیلی سیدھی مانگ کو دیکھ کر مجھے اُن کونجوں کی طویل کالی ڈاروں کا خیال آیا کرتا تھا جو لولاب کی حسین وادی میں کھلے نیلے آکاش کی وسعتوں میں تیرتی پھرتی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب اس کی لاش کو غسل دینے اور اُسے قبر تک لے جانے کی تیاری ہونے لگی تو میری اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ میں اس کے مسخ شدہ جسم کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ میں تو اس سے اتنی سی بھی وفا نہ کر سکا تھا اور خود میں اپنے بلند دعووں کو جھٹلا رہا تھا۔ اُس کی موت کے دن ہی تو صبح سویرے میں نے اُس سے کہا تھا کہ جب وہ مر جائے گا تو میں وادیٔ لولاب کے ایک حسین ترین مقام پر اس کی ایک نہایت ہی خوبصورت قبر بنواؤں گا اور اس کے کتبے پر لکھوں گا۔

'یہاں ایک خوبصورت خواب سویا ہوا ہے۔'

'اسے کوئی مت جگائے'

میں کتنا جھوٹا تھا۔ میں نے اس سے کتنی غلط بات کہی تھی۔

اور آج پینتیس ۳۵ برس کے بعد جب میں زندگی کے سفر میں خود اتنی دُور نکل آیا ہوں کہ گُمٹ کی ڈھکی اور رگھوناتھ بازار اور ریزیڈنسی روڈ اور پُرانی منڈی اور چوگان فتو کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئے ہیں اور اب کچھ ایسے راستے اور ایسی منزلیں سامنے ہیں جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی تو اندازہ نہیں۔ لگتا ہے کہ اس طویل سفر میں اب میرا کوئی ساتھی نہیں۔ میں ایک دم اکیلا ہوں اور اس تنہائی کے کرب ناک احساس کے دوران مجھے غلام نبی یاد آ رہا ہے۔ جو میرے ایک مسلسل کے سفر کا مستقل شریک تھا۔

میں اپنے اس ساتھی کے لئے ایک خوبصورت قبر بنانا تو درکنار اس کی حسین وادی میں بھی نہیں جا سکا۔ جس کی ایک حسین جگہ پر ایک خوبصورت گھر میں اس کی بے حد حسین ماں رہتی تھی۔ وہ آج بھی دریائے توی کے کنارے

پہاڑی کے پھیلاؤ میں اُجڑے قبرستان کی کسی ٹوٹی پھوٹی قبر میں پڑا ہے جسے کوئی پہچان بھی نہیں سکتا، اس کی خوبصورت امی بھی نہیں، جو شاید اب خود بھی وادیٔ لولاب کے کس گمنام کونے میں سو رہی ہوگی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر سکا اپنے اس معصوم اور پیارے رفیق کے لئے۔ ان پینتیس ۳۵ برسوں کے تلخ لمحوں کے تیز کُدالوں سے ایک گورکن کی طرح صرف اپنے خوابوں، ارادوں، تمناؤں، اور اُمیدوں کے لیے چھوٹی چھوٹی قبریں بناتا رہا ہوں اور انھیں ان قبروں میں اُتارتا رہا ہوں اور نہیں جانتا ہوں کہ یہ کتنے بھی کب تک زندہ رہیں گے۔ کسی کی زندگی کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کچھ۔ چاہے وہ اپنے خوابوں اور تمناؤں کے کتبے ہی ہوں۔۔۔

احساس کے گھروندے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری اور اس کی پہلی ملاقات کو بہت سمے نہیں گذرا تھا۔ ہماری کچھ ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس شام اس کا ارادہ مجھے راک گارڈن میں گھمانے کا تھا۔ تب راک گارڈن کی وہ شان اور وسعت نہیں تھی جو اب ہے۔ ان دنوں تو بہت ہی کم لوگوں کو اس کے وجود کا علم تھا۔ میں خود کبھی اس طرف نہیں آئی تھی۔ ایک دم اُجاڑ جگہ۔ سڑک سے ہٹ کر بہت اندر کی طرف ایک جنگل سا تھا' جس میں ببول کے بے شمار درخت تھے اور آدھے سوکھے اور آدھے ہرے سرکنڈوں کے اونچے اونچے جھنڈ تھے۔ اس نے کار سڑک کے ایک طرف پارک کر دی تھی اور مجھے ساتھ لیے پگڈنڈی سے گذرتے ہوئے جنگل کے اندر جا رہا تھا۔

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"راک گارڈن میں"

"مگر یہاں تو کوئی راک ہے نہ گارڈن۔ یہ تو ایک اُجاڑ جنگل ہے۔"

"ڈر رہی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ مجھے واقعی ڈر لگ رہا تھا۔

"تو واپس چلیں؟"

"نہیں۔ میں نے واپس چلنے کو تو نہیں کہا۔"

"اور کیا کہا ہے؟"

"صرف یہ پوچھا ہے کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔"

"یہ پوچھنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔"

وہ اپنی بات کا جواب سننے کے لیے رُک گیا۔

"رُک کیوں گئے ہو؟"

"اپنی بات کا جواب سننے کے لیے"

"تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ تم بڑے Sensitive - آدمی ہو اس لیے Unpredictable بھی ہو سکتے ہو"

اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔

"پریتی۔ تم مجھے پہلے اچھی طرح سمجھ لو پھر ججمینٹ دینا"

"آل رائٹ" میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اُن نتھرے ہوئے پانیوں میں مجھے کھوٹی نیت کا کوئی سکّہ چمکتا نظر نہ آیا۔ اس نے میرے بازو چھوڑ دیے۔ بازو کے علاوہ اس نے میرے جسم کے کسی حصّہ کو نہیں چھوا تھا۔

میں اس کے ساتھ جنگل کے عین درمیان بہت کم استعمال کی جاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ جس پر اُگی گھاس بھی ابھی لوگوں کے چلنے سے نہیں اکھڑی تھی۔ وہ سگریٹ سلگانے کے لیے رُکا تو میں بھی رک گئی۔

"چلتے چلتے سگریٹ نہیں سلگ سکتی کیا؟"

"سلگ تو سکتی ہے لیکن لطف نہیں آتا"

"تم تو سگریٹ سلگانے میں بھی لُطف تلاش کرتے ہو۔ عجیب آدمی ہو"

"زندگی کا ایک بھی لمحہ بے لُطف گذارنا گناہ کرنے کے برابر ہے۔ وہ لمحہ سگریٹ سلگانے میں صرف ہو یا پیار کرنے میں یا میوزک سننے میں یا پڑھنے میں یا بات کرنے میں۔ درحقیقت لمحہ لمحہ بٹوارا ہوا یہ لطف ہی جینا ہے۔ زندہ رہنا ہے۔ بقا حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ تو جو کچھ ہے وہ موت ہے۔ گناہ ہے۔ جُرم ہے"

"اتنا کچھ کہاں سے سیکھا ہے تم نے"

"زندگی سے۔ تم نے کچھ نہیں سیکھا زندگی سے کیا؟"

"سیکھا تو ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے سیکھا ہے وہ ایک دم مختلف ہے۔ تم پر زندگی مہربان رہی ہے، مجھ پر نہیں"

"زندگی تو سبھی پر مہربان رہتی ہے پریتی۔ جنگل میں اُگے اِن پیڑوں کی چھاؤں کی طرح۔ درختوں کی شاخیں بہت ہی نکیلے کانٹوں سے بھری پڑی ہیں۔ کسی شاخ کو چھونے سے ہی اُنگلی سے خون پھوٹ پڑے۔ لیکن ان شاخوں کی چھاؤں کتنی پیاری اور گھنی اور ٹھنڈی ہے۔ کہیں کسی کانٹے کی تیز نوک نہیں۔ کہیں کسی اُنگلی سے نکلے خون کی بُوند نہیں۔ یہ سب کچھ کتنا پیارا، کتنا پوتر۔ کتنا سندر ہے"

میں ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ بڑے سکون سے سگریٹ کا دھواں خاموش فضا میں بکھیرے جا رہا تھا۔ مجھے اس کی سبھی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ کہیں کہیں اُلجھ جاتی تھی میں۔ کسی نہ کسی جگہ پر آ کر میرا ذہن رُک جاتا تھا۔ آگے نہیں چل پاتی تھی میں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر رُک گئی۔

"رُک کیوں گئیں؟"

"تھک گئی ہوں۔"

"تو آؤ لوٹ چلیں۔ راک گارڈن پھر کبھی دیکھ لیں گے۔"

اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھما دیا اور پھر پل بھر کے لیے میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگا اس کی شخصیت بھی ببول کے گھنے پیڑوں کی طرح ٹھنڈی تھی اور اس میں کسی کانٹے کی تیز چبھن نہیں تھی۔ جس طرح ببول کے درختوں سے زرد زرد پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک نکلتی ہے۔ اسی طرح کی ایک بے نام سی خوشبو اس کے سائے سے بھی نکل رہی تھی۔

وہ سڑک پر واپس پہنچنے تک خاموش رہا۔ اس نے سائیڈ پر پارک کی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھولا پھر دھیرے سے میرے لیے بھی دروازہ کھول دیا۔ میں سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے پہلو میں۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔ ڈرائیو کرتے سمے اس نے کوئی بات نہ کی۔ ایک دم خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے وہ جنگل کا بھرپور سناٹا اپنے اندر سمیٹ کر واپس آیا ہو۔ مجھے لگا اس کے دماغ میں بہت شور تھا۔ اور وہ شاید اس لیے خاموش تھا کہ اس بے ہنگم شور کی کوئی پرچھائیں بھی باہر نہ نکل سکے۔ مجھے بھی بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھکی سُنسان سڑکوں کو بے مقصد دیکھتی رہی۔

پھر میرے ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر اُس نے کار روک دی۔ ایک بار بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھا پھر میری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ میں مجبوراً کار سے باہر نکل آئی۔

"بائی بائی" وہ بولا۔

میرے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اُس نے اور کار ایک دم زور سے گھما کر نکل گیا۔ مجھے لگا وہ کار کو ضرور ٹکرائے گا بجلی کے کسی کھمبے سے۔ لیکن وہ بڑے اعتماد سے پوری سپیڈ پر کار کو لے گیا اور میں جوں جوں اپنے ہاسٹل کے آہنی گیٹ کی طرف بڑھتی گئی اپنے آپ پر میرا اعتماد کمزور ہوتا گیا۔

دراصل میرا تعلق ایک چھوٹے سے گھر سے تھا۔ ایک غریب گھرانے سے۔ میں نے بچپن سے جوانی تک اس غریبی کو بھوگا تھا۔ جسے میرے ماں باپ جانے کب سے بھوگ رہے تھے۔ اس چھوٹے گھر میں رہتے ہوئے بھی میں نے تعلیم حاصل کی تھی اور کسی کا احسان نہیں اٹھایا تھا۔ تعلیم کے بعد نوکری بھی خود ہی تلاش کی تھی ایک پبلک سکول میں اور صرف تحفظ کے احساس کے لئے سکول کے ہاسٹل کی وارڈن بھی بن گئی تھی اور اسی ہاسٹل کے ایک الگ کمرے میں رہنے بھی لگی تھی۔ ہاں مہینے میں ایک بار اپنے ماں باپ سے ملنے ضرور جاتی تھی جو لدھیانہ میں تھے اور میرے چھوٹے بھائی کو تعلیم دلوا رہے تھے۔

چنڈی گڑھ میں آ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں ایک چھوٹا گھر چھوڑ کر ایک بہت بڑے گھر میں آ گئی تھی۔ جب میری ملاقات رتن سے ہوئی تھی میرا یہ احساس اور بھی مضبوط ہو گیا تھا کہ میں سچ مچ ہی ایک بڑے گھر سے وابستہ تھی۔ رتن ایک بڑے گھر کے ساتھ ساتھ ایک بڑے دل کا بھی مالک تھا۔ اس کے پیار میں بھی ایک بڑا پن تھا جیسے اس کی ہر بات میں ہوتا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت کا سب سے بڑا کمزور پہلو یہ تھا کہ وہ بہت Sensitive تھا اور فوراً ہی

اُکھڑ جاتا تھا۔

آج صبح میں اس خیال سے رتن کے گھر آئی تھی کہ اتوار تھا اور سوچا تھا کہ میں اس کے گھر کو ٹھیک ٹھاک کرونگی۔ اس کی کتابیں سنبھالوں گی۔ اس کے کپڑے ترتیب سے رکھوں گی پھر میوزک سنوں گی اور لنچ بھی خود ہی تیار کروں گی اور اس کے ساتھ لنچ کرنے کے بعد ہاسٹل لوٹ جاؤں گی اور شام تک آرام کروں گی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔

رتن کے ساتھ تو جھگڑا ہی تھا۔ وہ کس وقت اور کس بات پر بگڑ جائے کوئی نہیں جانتا تھا۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ بس اسے تو جھگڑا کرنا تھا مجھ سے۔ مجھے ستانا تھا۔ مجھے رُلانا تھا۔ میں اس کے گھر پہنچی تو اس نے کہا۔

"چلو صوفیہ لارین کی پکچر دیکھ آئیں۔"

"میں تو اپنی کولیگز کو پہلے ہی ٹال چکی ہوں پکچر کے لیئے مجھے یہاں آنا تھا۔ وہ سب گیارہ بجے کے شو پر پکچر ہال پہنچ جائیں گی۔"

"پہنچ جائیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے فرق رتن میں انہیں منع کر چکی ہوں پکچر کے لیے۔"

"تمہیں تو میرے ساتھ جانا ہے۔"

"نہیں۔ اس پوزیشن میں مجھے نہیں جانا چاہیئے۔"

"تمہیں چلنا ہوگا۔" اس نے بڑی اتھارٹی سے کہا۔

"نہیں میں جو کچھ سوچ کر آئی ہوں وہی کروں گی۔"

"تم وہ سب نہیں کرو گی۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو گی تم۔"

"آئی ایم سوری رتن۔ آخر مجھے بھی تو کچھ اختیار ہے اپنے آپ پر۔"

"نہیں میرے ساتھ رہ کر تمہیں اپنے پر کوئی اختیار نہیں۔"

"دس از رانگ۔ میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔"

"میں بھی تمہارا غلام نہیں ہوں۔" رتن نے غصے سے کہا۔

"مگر میں نے کب کہی ہے یہ بات۔"

"کہو یا نہ کہو۔ لیکن تم سمجھتی یہی ہو۔ اور مجھے یہ سب برداشت نہیں۔"

"تو میں چلی جاتی ہوں۔"

"ایک منٹ میں چلی جاؤ۔ چلی جاؤ پری۔ ورنہ۔" اس نے چیختے ہوئے کہا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور پھر اس نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔ اور مجھے جیسے گھر سے باہر نکال دیا ہو۔ جسمانی طور پر دھکے دے کر نہیں۔ ذہنی طور پر،

دماغی طور پر، قلبی طور پر۔ وہ دروازے پر رُکا بھی نہیں۔ دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر پل بھر میں اندر چلا گیا۔
جب تک میں نے رتن کے گھر والی لین پار نہیں کر لی میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا لیکن گیٹ کا ایک حصہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ وہ گیٹ بھی بند کرنے نہیں آیا تھا۔ مجھے واپس بلانے کیا آتا۔ گیٹ کے دونوں طرف اُگے یوکلپٹس کے اونچے اونچے پیڑوں کی لمبے لمبے پتوں سے بھری شاخیں تو ہوا میں جھولتی نظر آتی رہیں لیکن وہ شخص کہیں نظر نہ آ رہا تھا جس نے ایک بار کہا تھا ——
"یوکلپٹس کے پیڑ میں نے گیٹ کے دونوں طرف اس لیے لگا رکھے ہیں کہ وہ اس بات کی گواہی دیتے رہیں کہ اس گھر میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جس کی شخصیت کو مسلنے سے یوکلپٹس کے پتوں سے نکلتی ہوئی خوشبو پھوٹتی ہے اور جس کی شخصیت سے ایسی ہی پرتیں اترتی رہتی ہیں، جیسے کہ ان پیڑوں کے تنوں سے ان دنوں اترتی ہیں جب بہار کے دن قریب ہوتے ہیں اور پیار کرنے والوں کے دلوں میں ہلکی ہلکی آنچ جلتی ہے۔"
"کتنی پرتیں ہیں تمہاری شخصیت کی۔؟"
"جتنے آسمان میں تارے ہیں۔"
"کتنے تارے ہیں آسمان میں؟"
"جتنے تمہارے خوب صورت ملائم لمبے بال ہیں جنہیں کھول دینے سے بھری دوپہر میں بھی شام کی کیفیت چھا سکتی ہے۔"
بس اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا رتن۔ اس کی انہی باتوں نے تو پاگل بنا ڈالا تھا مجھے۔
اور آج اس نے دوپہر کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ صبح سویرے ہی بڑی بے دردی سے گھر سے نکال دیا تھا مجھے۔ دوپہر آتی تو اس میں شام کی کیفیت کو جگانے کا سوال اُٹھتا۔ دوپہر سے پہلے ہی تو سورج قتل ہو گیا تھا اور روشنی مر گئی تھی۔ اور اس مری ہوئی روشنی کی لاش اس کے گیٹ کے باہر پڑی تھی عین سڑک پر۔ اور اُسے کوئی اُٹھانے والا نہیں تھا۔ قتل ہوئے سورج کا خون تمام لین میں بکھرا پڑا تھا۔ اور کوئی نہیں تھا اس خون کو سمیٹنے والا۔ رتن کو کون بتائے کہ جب روشنی مر جاتی ہے تو دُنیا بھر میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ وہ تو اس سے اپنے قیمتی صوفے سے پیٹھ لگائے، اسٹول کو سرکا کر پاؤں پھیلائے سگریٹ پھونک رہا ہوگا۔ اور یوکلپٹس کے اداس پتوں کی یہ بات سننے سے انکار کر رہا ہوگا کہ گیٹ کے عین سامنے سورج قتل ہوا پڑا تھا۔ اور بنا میرے گیسوؤں کے کھولے ہی شام ہو گئی تھی۔
پاگل رتن جو سمجھتا ہے کہ اس کی شخصیت کی پرتیں اترتی جائیں۔ اور کوئی اِن مہین، چھوٹی چھوٹی پرتوں کو سمیٹتا رہے۔ وہ بہت خوش ہوگا اس وقت اپنی شخصیت کی ایک اور پرت اُترنے پر۔ پل بھر کو اُٹھے گا اپنے صوفے سے، جھانکے گا کھڑکی سے باہر اور یوکلپٹس کے اُونچے اونچے پیڑوں کو سلام کرے گا، دھیرے سے مسکرا کر —— جیسے کہ وہ فرسٹریشن لانے والے ہر لمحے کی موت پر کرتا ہے۔

لالہ رُخ

میری لالہ رُخ ——— !

تم میری زندگی میں اس وقت آئی ہو جب مجھے یہی نام پسند ہے۔ کبھی مجھے ثُریا، تسنیم، کملا اور سُدھا نام پسند تھے، جو بھی عورت میری زندگی میں آئی، چاہے وہ میری اس ڈھول سے اٹی راہ میں چند قدم ہی میرے ساتھ چل سکی ہو۔ میں نے فوراً اس کی اصلی انفرادیت کو اس سے الگ کر دیا اور اپنا زاویۂ نگاہ اس پر ٹھونس دیا۔ میں نے کملا کو ثُریا، نجمہ کو تسنیم، ساوتری کو کملا اور صُغریٰ کو سُدھا بنا ڈالا۔ میری نگاہوں نے ایک دم اُن کا اصلی روپ اُن سے چھین لیا۔ میں نے کبھی کسی کو اس کے حقیقی روپ میں نہیں رہنے دیا۔ میں نے دُنیا کی ہر چیز کو بدل کر ہی دیکھنا سیکھا ہے۔ میں نے کبھی کبھی ان جگمگاتے ہوئے سندر تاروں کو آسمان کی نیلی چھاتی پر دہکتے ہوئے پیپ سے بھرے پھوڑے کہا ہے۔ میں نے صبح سویرے باغ میں نیند کے نشے سے مخمور ادھ کھلی کلیوں کو سرد راکھ سے ڈھکی ہوئی چنگاریاں بھی لکھا ہے۔ اور رُوح تک میں پیوست ہو جانے والے نشتروں کو کبھی سکون آلود پھاہے سمجھا ہے۔ میں نے زندگی میں چیزوں کو اس شکل میں کبھی تسلیم نہیں کیا جس شکل میں وہ ہمیں نظر آتی ہیں۔ میں نے ان بے جان خاکوں میں اپنی پسند کے رنگ بھرے ہیں۔ جانے کیوں مجھے اس نظام میں ایک بھونڈا پن، کھردرا پن اور بے ڈھنگا پن نظر آتا ہے۔ میں نے کئی بار جھٹکے دے دے کر اس کی بُنیادوں کی ایک ایک اینٹ کو اُکھیڑا ہے اور اپنے تخیل میں ایک نئے نظام کی عمارت کھڑی کی ہے جس میں تاج محل کی سی چمک اور اجنتا کی تصویروں کی سی سندرتا رچی ہے اور پھر وہ نظام بھی تو بہت عرصہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔ میں نے اسے بھی بدلنا چاہا ہے۔ میں دُنیا کی ہر چیز کو بدل دینا چاہتا ہوں۔

تم میری زندگی میں اس گھڑی آئی ہو جب میں کھنڈروں میں گھوم رہا ہوں۔ ان میں موہن جو داڑو کے کھنڈر ہیں جو ہمیں ہماری پُرانی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ان میں ہیروشیما کے بھیانک کھنڈر ہیں جو انسان کے مہذب ہو جانے پر بھی اس کی بُنیادی سرکش تخریبی قوتوں کی ترجمانی کرتے ہیں اور پھر وہ کھنڈر بھی ہیں جن کا تعلق وقت اور جگہ سے کم انسانی ذہن سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ہیں محبت کے کھنڈر۔ اس عظیم عمارت کے ٹکڑے جن کا ہر کنکر بذاتِ خود ایک مکمل

عمارت ہے۔ اس کی تخلیق میں اپنا خون صرف کرنے والے کم ہیں اور اس کی دیواروں کو اپنا گرم خون دینے والے زیادہ۔ عمارت چاہے کیسی بھی ہو اُسے کھنڈر بننے تک خون کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ موہن جوداڑو کی کھدائی میں تمہیں آج بھی اس میں بسنے والوں کی ہڈیاں ملیں گی۔ ہیروشیما کے ملبے کے ڈھیروں میں تم آج بھی صحت منداور جوان خون کے داغ دیکھ سکتی ہو اور محبت کے کھنڈر بھی تمہیں خون سے لالہ زار دکھائی دیں گے۔ پہلے مجھے نرگس کا پھول پسند تھا کیونکہ اس میں ایک صبر آزما انتظار سلگتا رہتا ہے۔ پھر مجھے گلاب کا پھول پسند آیا، جس کی سُرخی زندگی اور حرارت کی ترجمان ہے۔ اور اب میں لالہ کو پسند کرتا ہوں۔ چند دنوں کے بعد شاید میں کسی اور پھول کو پسند کرنے لگوں کوئی اور رنگ مجھے اپنی طرف کھینچ لے۔ کوئی اور خوشبو میرے دماغ پر چھا جائے۔ لیکن اس وقت تو مجھے لالہ ہی پسند ہے۔ سُرخ سُرخ پیالہ جس میں کالا سا داغ یُوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی تپش اور حرارت سے خود ہی راکھ ہو رہا ہو، تم نے صبح کے نکھرے ہوئے لمحوں میں اس میں بھرے شبنم کے قطرے دیکھے ہوں گے، آگ اور پانی کا یہ امتزاج تمہیں پسند نہیں آیا؟ اس سیاہ داغ پر لرزتے ہوئے سفید سفید قطرے یُوں نظر آتے ہیں جیسے کوئی حسین آنکھ کسی زخمی دل پر آنسو بہا رہی ہو اور زخم کی تڑپن اور جلن میں گھٹوتی ہو رہی ہو، اور آج کل مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان طویل سرد راتوں میں تمہاری کلیوں سے دُھلی ہوئی تازہ جوانی میرے سلگتے ہوئے زخموں پر آنکھوں کی گہری جھیلوں سے پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے مار رہی ہو۔ کتنا سُرور ہے ان چھینٹوں میں، کتنی ٹھنڈک اور شانتی ہے ان میں جیسی سرما کی طویل، گہری اور اٹوٹ راتوں میں ہوا کرتی ہے۔ جیسی پہاڑوں کی عمیق گھاٹیوں میں ڈھلتی دوپہروں میں منڈلایا کرتی ہے۔

اسی لئے میں تمہیں لالہ رُخ کے نام سے مخاطب کر رہا ہوں۔ اتنی مدّت گزرنے کے بعد بھی میری وہ عادت نہیں چھوٹی۔ میں نے اب بھی اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے تمہارا نام بدل ڈالا ہے۔ جب دوسرے لوگ تمہیں تمہارے اصلی نام سے پُکارتے ہیں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں، تمہیں چڑا رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے میرے دیئے ہوئے اس نام کو تم بھی پسند کرو گی کم از کم تمہارے آنے والی زندگی میں یہ نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہوگا کبھی کبھی جب تم اپنی اُکتا دینے والی بیاہتا زندگی سے نالاں ہو جایا کرو گی تو یہ نام تمہیں ایک ایسے دور کی یاد دلایا کرے گا جو نہایت عارضی، نامکمل اور ناقابلِ فہم تھا۔ زندگی کے اتنے بڑے سفر میں ایسا وقفہ جس میں ایک فن کار کی خاموشی نے محبّت کے گیت گائے تھے۔ جب اس نے اپنے جذبات کے دیئے جلا کر تمہاری تنہا راتوں کو اُجالا تھا۔ جب اُس نے تمہارے حسن پر احساس کی کلیاں نچھاور کی تھیں۔ ان گذرتے لمحوں کا دھیان تمہیں اس وقت آئے گا جب اُن کا وجود صرف ہمارے ذہنوں کے تاریک اور گہرے کونوں میں سسک رہا ہو گا۔

مجھے اس وقت کسی ساتھی کی ضرورت نہیں تھی۔ کھنڈروں میں بھٹکنے کے لئے کسی رہنما یا رفیق کی حاجت بھی تو نہیں ہوتی۔ جب میں نواب اودھ کی بنائی ہوئی بھول بھلیوں میں گھوم رہا تھا۔ اس وقت مجھے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ ایک چھوڑ کئی ساتھی ملے بھی لیکن وہ میرے شکستہ پاؤں کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ میرے زخمی انگوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے ساتھ بھگانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں حتی الوسع بھاگا بھی لیکن زخمی انگوں سے خون کے فوارے پھوٹ

پڑے۔ میرے پاؤں شل ہو گئے اور میں رُک گیا لیکن کوئی بھی میرے پاس نہ ٹھہرا۔ سب آگے بڑھ گئے کسی نے بے مجھے سہارے دے کر اپنے ساتھ لے جانے کا خیال نہ کیا۔ مجھے ان بھول بھلیوں کے تاریک موڑوں پر چھوڑ کر سب آگے بڑھ گئے اور اپنے پیچھے اپنے نقرئی قہقہوں کی گونج چھوڑ گئے، جو دیر تک میرے دل پر بجلیاں گراتی رہی۔ اور جب کہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر کھنڈروں میں گھوم رہا ہوں، کبھی اپنے آپ پر ہنس دیتا ہوں، کبھی کچھ گنگنانے لگتا ہوں کبھی غصّے سے جھلا اُٹھتا ہوں۔ جب میں ذہنی طور سے اس بُری حالت میں ہوں تو تم میرے قریب جانے کہاں سے آ گئی ہو؟ تمہارے سُندر اور نکھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے شروع بہار کی ڈھلی ہوئی صبحیں یاد آ جاتی ہیں، جن میں تھکن اور گھٹن کا کہیں پر تو بھی نہیں ہوتا تمہاری آواز کو سُن کر مجھے کسی ایسے نغمے کی یاد آتی ہے، جس کی گونج کسی بھی بے حس اور تیز چٹان سے ٹکرا کر زخمی نہ ہوئی ہو۔ تمہاری چال دیکھ کر مجھے رات کے وقت جھیل کے پانی میں ڈولتا ہوا چاند نظر آنے لگتا ہے۔ تمہاری شخصیت کے ہر حصّے پر تازگی، معصومیت اور نفاست ہے کہیں بھی تو کرختگی اور شکستگی نظر نہیں آتی۔ تم سراپا بہار ہو۔ بہار کا کھنڈروں میں کیا کام؟ کھنڈروں میں تو بھیانک جھکڑ چلتے ہیں۔ تباہ کن طوفان انگڑائیاں لیتے ہیں۔ تم کیسے آ گئیں اس بھیانک وادی میں؟ کہیں تم راستہ تو نہیں بھول گئیں؟ کوئی کھلنڈرا تمہیں جھکمہ دے کر یہاں پریشان ہونے کے لئے تو نہیں چھوڑ گیا؟ تم اس دیش کی معلوم نہیں ہوتیں۔ تم کسی دوسری دنیا کی ہو جہاں حسن اور عشق سمندر کے کناروں سے سیپیاں چُن چُن کر تاج محل بنایا کرتے ہیں، جہاں شبنم کے رونے پر پھول ہنسا نہیں کرتے بلکہ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں ستارے صبح کے انتظار میں رات بھر آنکھ مچولی کھیلا کرتے ہیں۔

کیا کہہ رہی ہو؟ تم کھنڈروں کو آباد کرنا چاہتی ہو؟ یہ ناممکن ہے۔ کھنڈر کبھی آباد نہیں ہُوا کرتے۔ کھنڈر تو بربادی اور ویرانی کا دوسرا نام ہے۔ تمہاری یہ عمر ان نکیلے کنکروں اور بے حس پتھروں میں گھومنے کی نہیں۔ تمہارے پاؤں میں ٹخنوں سے ٹکراتی ہوئی تمہاری پائلیں کتنی خوبصورت لگتی ہیں۔ جب تم چلتی ہو تو گھنگھرو کی ہلکی ہلکی پیاری پیاری گونج یوں اُبھرتی ہے جیسے محبت کا ایک عظیم کارواں دھیرے دھیرے منزل کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ان اونچی اونچی چٹانوں سے ٹکرا کر تمہارے گھنگھرو ٹوٹ جائیں گے۔ پائلیں زخمی ہو جائیں گی۔ پھر ان کے گیت کون سنائے گا؟ تمہاری کلائیوں میں پڑی ہوئی کانچ کی یہ سُرخ سُرخ چوڑیاں کس انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں، جیسے گردش کرتے اچانک دو ستارے ٹکرا جائیں اور فضا میں چوندھیا دینے والی روشنی بھر جائے۔ کتنی مدہوشی ہے چوڑیوں کے اس ٹکراؤ میں! خُدا کے لئے ان کلائیوں سے گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے کی کوشش نہ کرو۔ ہاتھ زخمی ہو جائیں گے۔ تمہاری آنکھیں کتنی پیاری ہیں، جیسے اماوس کی رات کو آسمان کی گمبھیر اور محدود وسعت میں کچھ چراغ جھلملا رہے ہوں۔ کاش یہ چراغ ابد تک یونہی جھلملاتے رہیں! کھنڈروں میں منڈلاتے ہوئے طوفان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں! تمہارا یہ شفاف ماتھا کتنا پیارا ہے، جیسے کنول کے پھولوں کو چاندنی سے نہلایا گیا ہو۔ کھنڈروں سے اُڑتی ہوئی گرد اُن کو مرجھا دے گی۔ تم ان کھنڈروں میں نہ گھومو۔ کھنڈر آباد نہیں ہوا کرتے بلکہ اس کوشش میں تم اپنے آپکو برباد کر لو گی۔ پُوچھ رہی ہو کہ میں یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا؟

تم بہت سادہ ہو۔ میرے لئے تو اور کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔ اور کوئی جگہ ہوتی تو میں یہاں آتا ہی کیوں؟ میں تو سب جگہوں پر گھوم آیا۔ ڈگر ڈگر پر ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن مجھے کہیں پناہ نہیں ملی۔ ہر منزل نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ ہر دروازے نے مجھے دھتکار دیا اور میں آگے ہی آگے چلتا گیا۔ واپس آنے کے تمام راستے بند کرتا رہا۔ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے اب آگے ہی بڑھنا ہے۔ میں نے وہاں پہنچنا ہے جہاں یہ کھنڈر ختم ہوتے ہیں۔ جہاں ٹوٹی ہوئی محرابیں اور شکستہ گنبد ہمارا راستہ نہیں روکتے، جہاں صرف ہموار اور چٹیل میدان ہیں، جن میں دُور دُور تک کسی درخت کی چھاؤں نظر نہیں آتی۔ جہاں اُوپر کو اُڑان بھرنے کی جُرأت کرنے والا پنچھی جھلس کر نیچے گر جاتا ہے۔ جہاں شام کو خون کی طرح سرخ آندھیاں چلتی ہیں اور جہاں صبح یوں بیدار ہوتی ہے جیسے کوئی نئی نویلی دُلہن سُہاگ لُٹ جانے کے بعد سفید چادر اوڑھ رہی ہو۔ تمہیں یہ راستے راس نہ آئیں گے۔ تمہیں نظر آ رہا ہے نا چمکتا ہوا وہ مینار۔ ہم جان بوجھ کر اس کے وجود سے انکار کر رہی ہو۔ اُسے پھر غور سے دیکھو، تمہیں وہاں جانا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے راستہ بھول کر اس طرف آگئی ہو۔ کہو تو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ کر پھر لوٹ آؤں گا۔ میں نے تم سے پہلے بھی کئی انسانوں کو اس مینار تک پہنچایا ہے جس کے اِردگرد روشنی ہی روشنی ہے۔ جہاں ہر لمحہ بہار کے پھول کھلے رہتے ہیں، پرندے چہچہاتے ہیں اور جھرنے ہر مسافر کی پیاس بجھانے کو آگے بڑھتے ہیں۔ کیا کہا میں بھی وہیں چلا چلوں؟ یہ مشکل ہے۔ مجھے روشنی سے خوف آتا ہے۔ روشنی کی تیز شعاعیں میرے زخموں میں نشتروں کی طرح چبھتی ہیں اور میں تلملا اُٹھتا ہوں۔ میں بہت کمزور دل کا انسان ہوں۔ درد سہنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ میں درد ہونے پر چیختا نہیں، خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹ کر اُسے پی جاتا ہوں۔ لیکن میری روح میں تو جیسے ایک بھٹی سی سلگ رہی ہوتی ہے اور مجھے اندر ہی اندر راکھ کر ڈالتی ہے۔ مجھے ہر اس چیز سے خوف آتا ہے جو روشنی پھیلائے۔ میں چاندنی راتوں کی نسبت اندھیری راتوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ چاندنی راتیں دھرتی کے سینے میں چھپے ہوئے گہرے گہرے ناسوروں کو اُجاگر کرنے لگتی ہے اور اندھیری راتیں ایک گھنا سیاہ پردہ ڈال کر انہیں لوگوں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بچا لیتی ہیں۔ میں اپنے خاکوں میں رنگ اندھیرے ہی میں بھرتا ہوں۔ روشنی میں رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر عجیب دھبے سے لگنے لگتے ہیں

کیا کہہ رہی ہو میں تم سے بے رُخی سے پیش آ رہا ہوں؟ تمہارا خیال درست ہے۔ تمہیں میں جتنا زیادہ اپنے نزدیک آنے دوں گا، ان کھنڈروں میں گھومنے کا تمہارا ارادہ اتنا ہی پختہ ہو جائے گا۔ اسی لئے میں تمہاری طرف دیکھنے کی بھی جُرأت نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ میری نظریں تمہیں قریب کھینچ لائیں گی۔ میرے سینے میں جلتا ہوا داغ کسی وقت اتنی شدت سے سلگنے لگتا ہے کہ میں اپنے اردگرد بکھری ہوئی چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ میری نگاہیں اپنے کھولتے ہوئے سینے پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ ان کھنڈروں میں گھومنے والے ہر انسان کے سینے میں تمہیں ایسا ہی ایک داغ ملے گا۔ جب یہ داغ دہکنے لگتا ہے تو نرک کے انگارے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے اگر کبھی تمہیں بھی ایسا ہی کوئی داغ مِل گیا تو کیا ہو گا؟ تمہارا یہ نازک اور بات بات پر دھڑکنے والا سینہ اس کی جان لیوا تپش برداشت نہ کر سکے گا تمام زندگی گزر جائے گی اس پر آنسوؤں کے چھینٹے مارتے ہوئے اور اس کی تپش پھر بھی کم نہ ہو گی

لیکن تم تو میرے اور نزدیک سرک رہی ہو! تمہاری آنکھوں میں یہ نشہ سا کیوں چھا رہا ہے؟ تم بھول رہی ہو کہ تم میرے گھر میں صرف چند دنوں کے لئے آئی ہو۔ تمہارا بھائی جانے کیوں مجھ ایسے خود غرض انسان پر اتنا اعتماد کر کے تمہیں میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔ تمہارے آنے سے پہلے مجھے میرے گھر والے اجنبی سے نظر آتے تھے۔ مجھے اس گھر میں رہتے ہوئے اور ان لوگوں کے درمیان سانس لیتے ہوئے پچیس سے اوپر سال ہو گئے ہیں لیکن میں نے اتنے طویل عرصے میں بھی ان کے لئے کوئی اپناپن محسوس نہیں کیا۔ میں آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ وقت کی ایک تیز لہر نے مجھے ایک ایسے جزیرے پر لا پھینکا ہے جہاں کچھ ایسے لوگ آباد ہیں جن کا ذہنی لحاظ سے میرے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ دنیاوی لحاظ سے وہ میرے سگے ہیں، لیکن مجھے اپنے اور اُن میں کوئی ذہنی اور روحانی مطابقت نظر نہیں آتی۔ تم آئی ہو تو ماحول جانے ایک دم کیسے بدل گیا ہے۔ چاہتا تو اب بھی جھوٹ بول کر تمہیں تکلیف دے سکتا تھا لیکن تم سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے جیسے تم میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں رہ رہی ہو اور میری زندگی سے بخوبی واقف ہو۔ تمہیں میرے سچ اور جھوٹ کی فوراً پہچان ہو جائے گی۔ اس لئے سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے اس طرح اچانک اس گھر میں آ جانے سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تپتی ہوئی دوپہر میں کہیں سے ایک سرد جھونکا میرے جھلسے ہوئے جسم سے آ ٹکرایا ہو۔ میں اس جھونکے کے ہر لمس پر ایک انوکھی سی شانتی کا احساس کرتا ہوں۔ لیکن میں ان خنک اور راحت بخش جھونکوں کا عادی نہیں۔ مجھے تو ریگ زاروں سے اُڑتے ہوئے بگولے ہی بھاتے ہیں۔ چند لمحوں کی اس آسائش کی خاطر عمر بھر کی پونجی لٹا نا تو گھاٹے کا سودا ہے۔ لالہ رُخ !

تم میرے سینے میں بھرے اَن گنت زخموں کو لے کر ایک ادھ کھلی شگفتہ کلی دینا چاہتی ہو۔ تمہیں یہ کلی عزیز ہے اور مجھے میرے زخم۔ تم جگر تک کو پگھلا دینے والا درد مجھ سے چھین کر مجھے نیند دینا چاہتی ہو۔ لیکن درد کی قدر و قیمت تو میں ہی جانتا ہوں۔ تمہیں نیند کی ضرورت ہے کیونکہ تم اس پردے پر سپنوں کے پھول کاڑھ سکتی ہو اور کتنے حسین ہوتے ہیں سپنوں کے پھول! مجھے تو صرف درد ہی سے زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ جب شدت کا درد سینے میں اُٹھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ ورنہ ایک پتھر اور ایک انسان میں فرق ہی کیا ہے؟ یہ چند دنوں کا وقفہ بہت جلد بیت جائے گا۔ پھر رمیش آ جائے گا اور تمہیں اپنے ساتھ بمبئی لے جائے گا۔ جہاں تم ایک رومانی ماحول میں رہ کر زندگی گزارنے کے مختلف ڈھنگ سوچا کرو گی۔ تم کیوں ناحق یہ دردِ سر مول لیتی ہو۔ کوشش کرو کہ یہ حقیر سا وقفہ گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح اجنبی رہ کر ہی گزر جائے۔ اگر وہ پچیس سال تک میرے قریب رہ کر میرے نہیں ہو سکے تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ چند دنوں میں میرے دماغ اور دل پر چھا کر مجھ پر قابض ہو جاؤ؟ تم نہیں جانتیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے قابو میں لانے کے لئے کیا کیا گورکھ دھندے بنائے ہیں لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے اور تم چاہتی ہو کہ تم بنا کسی جدوجہد اور کشمکش کے مجھے اپنے قابو میں کر کے میری زندگی کو قید کر ڈالو۔ اس پنچھی کو قفس کی سلاخوں کے پیچھے پھینک دو جو تاروں تک پہنچنے کا عزم لے کر رات بھر پرواز کی کوشش کرتا رہتا ہے اور جب تک صبح نہیں ہو جاتی اور ستارے قہقہہ لگا کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتے وہ اپنی جدوجہد ترک نہیں کرتا۔

تمہیں کیوں میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رہتا ہے ؟ میں رات بھر اپنے کمرے میں رکھی چیزوں کی ترتیب بگاڑتا رہتا ہوں اور صبح آوارہ گردی کرنے کے لئے گھر سے باہر نکل جاتا ہوں اور جب لوٹتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے کمرے میں نہیں کسی شیش محل میں کھڑا ہوں اور پھر مجھے اپنے آپ میں شرم سی آنے لگتی ہے۔ تم نے میری غیر حاضری میں کمرے میں ایک پُر سکون انقلاب بھر دیا ہوتا ہے۔ میرے گھر والے میری بے رُخی اور بے توجہی کے عادی ہو چکے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ میں آسانی سے مرنے والا نہیں۔ اب انھوں نے میری طرف زیادہ دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنے کپڑوں کو ادھر اُدھر پھینک جاتا ہوں اور تم انھیں تہہ کر کے الماری میں رکھتی رہتی ہو۔ میں بُوٹ اور چپلوں کا ایک ڈھیر سا بنا کر مطمئن ہو جاتا ہوں اور تم انھیں پونچھتی ہو، پالش کرتی ہو اور ریک میں سجا دیتی ہو۔ تمہیں کیوں میرے کھانے اور چائے کی فکر رہتی ہے۔ یہ کام اور لوگوں کا ہے تمہارا نہیں۔ تم تو میرے گھر میں ایک مہمان ہو، جسے چند روز کے قیام کے بعد چلا جانا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری دیکھ بھال کروں اور تمہاری ہر تکلیف کا احساس کروں، لیکن یہاں تو بات اُلٹ ہو رہی ہے، جو کچھ مجھے کرنا چاہئے تھا وہ تم کر رہی ہو۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے میں تھکا اور پریشان سا آنکھیں موندے پلنگ پر پڑا تھا۔ جانے تم میرے کمرے میں دبے پاؤں کیسے آ گئیں۔ مجھے تو پتہ بھی نہ چلا۔ اور پھر تمہارے نازک گورے گورے ہاتھ میری پیشانی کو دبانے لگے۔ میں نے چاہا کہ آنکھیں کھول دوں لیکن میں نے نہیں کھولیں۔ تم میرے دُکھتے ہوئے ماتھے کو دباتی رہیں اور میں ایک لطیف سکون کا احساس کرتا رہا۔ تم نے سمجھا شاید میں سو رہا تھا۔ تمہارے ہاتھ میرے ماتھے سے اچانک ہٹ گئے۔ میں حیران ہو کر آنکھیں کھولنے ہی والا تھا کہ تمہارے ہاتھ میرے گرد سے اٹے ہوئے پاؤں کو دبانے لگے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن میں نے انھیں آنکھوں میں ہی گھونٹ کر کچل ڈالا۔ اور پھر تمہارا برف سا سفید ماتھا میرے پاؤں پر ٹِک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے چاند کو کسی نے آسمان کی نیلی وسعت سے نوچ کر سیاہ دلدل میں پھینک دیا ہو۔ میرے احساس لطیف کو دھکا سا لگا۔ میں نے چاہا کہ چاند کو اِس طرح گرنے سے بچا لوں اور میں نے اپنے پاؤں کھینچنے چاہے۔ اور تم لمحہ بھر میں ہی کمرے سے یوں باہر نکل گئیں جیسے کسی نے تمہیں چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ تم کتنی سادہ اور معصوم ہو لالہ رُخ ــــ! مجھے واقعی خوف آتا ہے تمہیں چھوتے ہوئے۔ ڈرتا ہوں، میری داغدار انگلیاں تمہارے کومل اور شفاف جسم پر کہیں کوئی نشان نہ چھوڑ جائیں۔ لیکن تم اس شدت سے میری طرف کیوں بڑھ رہی ہو، میں وہ نہیں جسے تم ڈھونڈ رہی ہو۔ میں کوئی اور ہوں۔ میں وہ ہوں جو کبھی تمہارے قابل نہیں ہو سکتا۔ جس انسان کو تم ڈھونڈ رہی ہو وہ ان کھنڈروں کی دہشت اور کرختگی میں تمہیں نہ ملے گا۔ اُسے ڈھونڈنے کے لئے کہیں اور جاؤ۔ کہیں اور جہاں پھول صرف کھِلتے ہوئے نظر آتے ہیں، انھیں مُرجھاتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا۔ جہاں تارے صرف چمکتے ہی ہیں۔ گھٹاؤں میں چھپ چھپ کر آنسو نہیں بہاتے۔ جہاں ساز کے تاروں سے مدبھرے نغمے پھوٹتے ہیں، اُن سے سسکیاں نہیں نکلتیں۔ لیکن تمہیں یہ سب منظور نہیں! پاگل ہو، ٹھیک راستہ سمجھانے والے پر تمہیں بھروسہ نہیں۔ اپنے جذبات پر زیادہ اعتبار ہے، جو تمہاری آنکھوں کے سامنے گھنی دھند پھیلا کر تمہیں بھٹکانا چاہتے ہیں۔ میری بات نہیں مانتیں تو نہ مانو لیکن ان کھنڈروں کی طرف تو دھیان دو جو اپنی زخمی زبانوں

ے کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم کیوں ناحق ایک معصوم جان کا خون ہمارے سر چڑھاتی ہو۔ تم ان اندھی کھائیوں اور اونچے کنگاروں کے باہمی ٹکراؤ میں پس جاؤ گی۔ اور ہمارا یہ دکھی فن کار اپنے چھلنی ہو چکے سینے میں ایک اور تیز دہکتا ہوا انگارہ مسل مسل کر تڑپتا رہے گا۔ ہمیں اس زخمی کلاکار کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ہماری کہانیاں باغ میں کھلی کلیوں سے لے کر آسمان میں چمکتے ستاروں تک کو سناتا ہے۔ زمین پر رہنے والے دکھی انسانوں سے لے کر آسمان میں بسنے والے فرشتے تک اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہماری بنیادوں میں محبت اور وفا کی لاتعداد کہانیاں دبی پڑی ہیں۔ اور یہ غریب رات کے گہرے سائے میں کدال لے کر اُن بنیادوں کو کھودتا ہے اور جب اُسے کوئی کہانی مل جاتی ہے تو اس کی افسردہ آنکھیں چند لمحوں کے لئے خوشی سے چمک اٹھتی ہیں۔ محنت سے پیدا ہوئے پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر یوں چمکنے لگتے ہیں، جیسے کہکشاں اُس پر قربان ہو رہی ہو۔ خدا کے لئے اُسے ہم سے نہ چھینو۔ اُسے یہیں رہنے دو اور خود چلی جاؤ۔

اب تو چلی جاؤ لالہ رُخ! یہ کھنڈر بھی تمہیں جانے کو ہی کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں بھر رہے ہیں؟ تمہارے ہونٹ کپکپا کیوں رہے ہیں؟ تمہارا جسم ہولے ہولے لرز کیوں رہا ہے؟ یہ حالت تو اس وقت ہوتی ہے جب کوئی معصوم جوانی پہلی بار محبت کا گیت گنگنانا چاہے۔ لیکن اس سے ساز نہ سنبھل رہا ہو۔ دیکھو ساز کو مضبوطی سے سنبھالے رکھو۔ گیت اب نہ سہی پھر کسی وقت بھی گا سکتی ہو لیکن اگر ساز ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا تو وہ ہمیشہ کے لئے گنگ ہو جائے گا۔ تمہارے لاکھ چھیڑنے پر بھی اُن کے تاروں سے نغمہ نہیں پھوٹے گا ـــــ اُف کتنی ضدی ہو تم! تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں اس طرح دبوچ لیا ہے جیسے اب کبھی اُسے نہ چھوڑو گی۔ جیسے اس زخمی ہاتھ کو تم ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھو گی۔ لیکن وہ دیکھو اُفق پر ایک سُرخ دُھند جمع ہو رہی ہے۔ ابھی ایک خونی آندھی چلنے لگے گی، ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا۔ اِن کھنڈروں میں بھوت چیخنے لگیں گے۔ اس وقت تم ڈر جاؤ گی، تمہارا نازک سینہ زور زور سے دھڑکنے لگے گا۔ میرا ہاتھ خود بخود تمہارے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا اور پھر ـــــ اور پھر ـــــ ••

ایک اور خُدا

جہاں میں رہتا ہوں وہ ایک چھوٹی سی لین ہے جس میں کُل دس سرکاری مکان ہیں۔ ترتیب اس طرح ہے کہ ہر مکان کے سامنے ایک اور مکان ہے اور اس طرح دس عمارتیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ یہ سب اچھی کشادہ عمارتیں ہیں جن کے ساتھ ایک انیکسی بھی ہے اور خاصا کھُلا لان بھی۔ ہر کوٹھی کے گیٹ کو دیکھنے سے بھی عجیب و غریب کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کوئی گیٹ تو ایک دم بند ہے۔ اور اس کے دونوں حصے آہنی پیچ کی گرفت میں گھرے ساکت و جامد کھڑے ہیں۔ کوئی آدھا گیٹ کھُلا ہے کوئی تین چوتھائی اور کوئی صرف ایک چوتھائی۔ ایسا گیٹ شاید میرے ہی گھر کا ہے جس کے دونوں حصے الگ الگ سمتوں میں کھُلے پڑے ہیں۔ ایک حصّہ اندر کی طرف کھُلا ہے، دوسرا باہر کی طرف۔ گیٹ ایک دم چوپٹ کھُلا۔

یہ کیفیت ان کوٹھی نما مکانوں کے سامنے والے حصّے کی ہے۔ پیچھے والے حصّے کی کیفیت ایک دم مختلف ہے۔ اُن کے پچھواڑے میں ایک بائی لین ہے جو سب مکانوں کے لانز کے پیچھے سے گزرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ برس پہلے یہ بائی لین کسی اور طرح سے استعمال ہوتی رہی ہو۔ لیکن اب تو یہاں اس لین اور اس سے ملحقہ علاقے میں کام کرنے والے سرکاری جمعدار کُوڑا کرکٹ پھینکتے رہتے ہیں اور کوٹھیوں میں کام کرنے والے مالی تمام جھاڑ جھنکاڑ، پتّے اور گھاس ڈالتے رہتے ہیں۔

میرا مکان چونکہ اس لین کا آخری مکان ہے اس لیے بائی لین کا شروع کا حصّہ اور اگر دوسری سمت سے دیکھیں تو آخری حصّہ میرے لان کی اونچی باڑ کے ساتھ لگتا ہے۔ بائی لین کا یہ حصّہ قدرے صاف ہے۔ کیونکہ سرکاری جمعدار اپنا سرمایہ ذرا آگے جا کر جمع کرتے ہیں، یہاں نہیں ڈالتے۔ بس اس صاف سی جگہ پر پچھلے کچھ مہینوں سے گھاس پھونس کی ایک جھُگی ڈل گئی ہے۔ اس جھُگی کی بھی ایک کہانی ہے۔ ویسے ہر جھگی جھونپڑی کی ایک کہانی ہوتی ہے جو ہمیشہ ہی آغاز سے لے کر کلائمیکس تک کسی باوقار اور وسیع عمارت سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر جھُگی کی کہانی کا عنوان اس کی پیشانی پر درج ہوتا ہے۔ اس گندے سے کپڑے پر جو دروازے کی جگہ جھُگی کے باہر لٹکا رہتا ہے، کہانی اندر ہوتی ہے، عنوان باہر۔

کبھی کبھی عنوان اندر چلا جاتا ہے۔ اور کہانی باہر تیز ہوا میں کھڑی ٹھٹھرتی رہتی ہے۔

عنوان سے پہلے میں نے بھی کہانی ہی کو دیکھا تھا جو اپنی گھاس پھوس کی جھگی کے سامنے اپنی پھٹی پرانی دھوتی کو اپنے اِرد گِرد سمیٹے تیز ہوا سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دُبلی، پتلی، سلونی سی کہانی لین کی نکڑ پر کے چھوٹے سے بکائن کے پیڑ کی ایک جھولتی ہوئی شاخ کی طرح۔

بکائن ہی کے پیڑ کی چھاؤں میں میرے گھر کے باہر ایک دن مصری لال کھڑا تھا۔ اپنے چہرے پر دنیا بھر کی کڑواہٹ کھنڈائے۔

"کون ہو بھائی تم؟" میں نے پوچھا۔

"مصری لال دھوبی، حجور۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"حجور، کپڑے پریس کرنے کے لیے میز لگا رہا ہوں؟"

"کس کی اجازت سے۔"

"حجور، ماں جی سے پوچھ لیا تھا۔"

"کب؟"

"کل حجور۔"

میں کئی دنوں سے باہر تھا، اس لیے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ظاہر تھا کہ مصری لال اپنے چہرے پر دنیا بھر کی کڑواہٹ کھنڈائے میری دھرم کرم کی پکی ماں کے پاس پہنچ گیا ہوگا اور بڑے ہی قابل رحم انداز میں اپنی بپتا کا برنن کیا ہوگا۔ ماں نے اپنی عادت سے مجبور اُسے گیٹ سے باہر کوٹھی کے کونے پر لگی بکائن کے نیچے اڈا جمانے کی اجازت دے دی ہوگی اور ساتھ میں روپیہ دو روپیہ کوئلوں کے لیے بھی دے دیے ہوں گے۔

"ماں سے کچھ روپیہ پیسہ بھی ملا؟"

"حجور، انھوں نے دو روپئے کوئلوں کے لیے دیے تھے، وہ میں کپڑوں کی پریس کرائی کے حساب میں ٹھیک کر لوں گا۔"

میں مصری لال کی بات کا جواب دیے بغیر اندر چلا آیا۔ ماں نے من کی شانتی کے لیے ایک اور اُپکار کر لیا تھا۔ ماں ایسے اُپکار کرتی رہتی تھی۔ رات کھانے کی میز پر بیٹھے ماں نے بتایا کہ تین روز پہلے مصری لال اُس کے پاس آیا تھا اور مکان کے باہر نکڑ پر بکائن کی چھاؤں میں اپنا اڈا لگانے کی اجازت مانگی تھی۔

بس یہیں سے بائی لین کی نکڑ پر میرے لان کی باڑ سے سٹی، اُس گھاس پھوس سے بنی جھگی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

مصری لال بڑا ستھرا کام کرتا تھا۔ پوجا پاٹھی آدمی تھا۔ کپڑے پریس کرنے والی میز کے ساتھ ہی بکائن کے پتلے سے تنے پر اُس نے ہنومان جی کی شیشے کے فریم میں جڑی ایک چھوٹی سی تصویر لٹکا رکھی تھی۔ ہمارے لان میں سے

ہر روز ایک آدھ پھول بھی توڑ کر اس پر چڑھا دیتا تھا۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار گزرتی تھی لیکن ماں نے اس کی حمایت کی تھی اور کہا تھا کہ پھول بھگوان کے ارپن ہو رہے تھے۔ اس سے زیادہ ہمارے لان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ میں ماں کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا تھا۔ مصری لال نے وہیں پیڑ سے ذرا ہٹ کر دو اینٹوں کا چولھا بنا لیا تھا۔ وہیں وہ اپنے کھانے پینے کا پربندھ کر لیتا تھا۔ شام کو ایک آدھ رکشا چلانے والا اس کے پاس آ جاتا اور مصری لال گئی رات تک اپنی ٹھیٹھ پوربی بولی میں اس سے باتیں کرتا رہتا اور پھر اسی میز پر جس پر وہ کپڑے پریس کرتا تھا، سو جاتا۔

ایک دن دوپہر کو مصری لال آیا۔ نومبر کے آخری دن تھے۔ میں لان میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔

"کہو کیسے ہو مصری لال؟"

"اچھا ہوں حجور۔"

"تمھارے ہنومان جی کیسے ہیں؟"

"مزے میں ہیں۔"

"وہیں بکائن کے پیڑ پر؟"

"نہیں حجور۔ اب انھوں نے استھان بدل لیا ہے۔"

"کہاں"

"دیوار کے ساتھ۔ بہت اچھے لگتے ہیں وہاں۔"

"منگل کو پرشاد نہیں چڑھاتے"

"ماں جی سے لے جاتا ہوں پرساد حجور۔"

مصری لال گھاس پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ایک چھوٹی سی ڈبیا میں سے تھوڑا سا گیلا چونا نکالا اور اسے زبان پر رکھ لیا۔

"میرا بھتیجا اور اس کی بہو آ گئے ہیں دیس سے" وہ بولا۔

"وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"حجور بھتیجہ کچھ مجوری دھجوری کرے گا۔ بہو ماں جی کی سیوا کر دے گی۔"

"تمھیں معلوم ہے ماں جی کسی سے کام نہیں کرواتیں۔ برتن چوکا خود ہی کرتی ہیں۔"

"بہو اوپر کا کام کر دے گی۔"

"مگر یہ لوگ رہیں گے کہاں؟"

"ادھر گلی میں جھگی ڈال لیں گے حجور۔" مصری لال نے بائی لین کے اس حصے کی طرف اشارہ کیا، جو لان کی اونچی اونچی باڑ کے ساتھ تھا۔

"لیکن اس میں تو جمعدار جہان بھر کا کوڑا ڈالتے رہتے ہیں۔"

"صاحب جھگی بن گئی تو پھر ادھر کوئی کوڑا نہیں ڈالے گا۔"

"ماں جی سے پوچھ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

مصری لال نے ماں کی بھی اجازت لے لی اور ایک ہی دن میں بائی لین کے ناکے پر گھاس پھوس کی ایک جھگی کھڑی ہو گئی۔ شام کو جب میں سیر کے لیے گھر سے نکلا تو ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے میں پھڑپھڑاتی اس نئی جھگی کی نئی کہانی کو باہر کھڑے دیکھا۔ ایک پتلی سی، سانولی سی کہانی جس کا عنوان جھگی کے اندر تھا جیسے کسی نے ہلکی ہلکی روشنائی میں ایک خوبصورت سی ننھی کہانی لکھ ڈالی تھی۔ کہانی کا نام تھا، کٹوری!

نام خوبصورت تھا۔ کہانی پر فٹ بیٹھتا تھا۔

تب ہی جھگی کے اندر سے مصری لال برآمد ہوا۔

"حضور یہ ہے میری بہو، کٹوری، نمستے کرو صاحب کو۔" اس نے ایک ہی جملے میں مجھے بھی اور اپنی بہو کو بھی مخاطب کر لیا تھا۔

کٹوری نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو ماں جی سے مانگ لینا۔" میں نے کٹوری سے کہا اور جب اسے ایک بار غور سے دیکھا تو لگا اس کے جسم کے اندر ایک اور کہانی مکمل ہو رہی تھی۔ ایک اور خدا تخلیق ہو رہا تھا۔

"میں ابھی اسے ماں جی کے پاس لے جاؤں گا صاحب۔"

مصری لال کی بات کا جواب صرف ایک مسکراہٹ سے دیتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ ٹیگور کی کہیں لکھی ہوئی سطریں ذہن میں گونجنے لگیں، انسان کی عظمت کی اور ایک گواہی۔ ایک اور بیان، ایک اور ثبوت۔

بس یہیں سے اس نئی جھگی کی کہانی شروع ہو گئی۔

کٹوری گھر میں اوپر کا کام کرنے لگی، اس کا چار برس کا لڑکا میوہ لال لان میں کھیلتا رہتا اور ماں کا من لگائے رکھتا۔ مصری لال کپڑے پریس کرتا اور اس کا بھتیجا جگ لال رکشا چلاتا۔ یوں میرے گھر کا رشتہ گھاس پھوس کی اس جھگی سے جڑ گیا۔ اونچی عمارتوں میں رہنے والے جھگیوں کے باسیوں سے اس قسم کے رشتے تو جوڑ لیتے ہیں ان سے آگے نہیں بڑھتے۔

جنوری کی کڑاکے کی سردی تھی۔ میں مدراس سے واپس آیا تھا۔ دہلی سے رات کے گیارہ بجے والی بس لی، جس نے مجھے صبح پانچ بجے چنڈی گڑھ پہنچا دیا۔ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ گھر پہنچتے ساڑھے پانچ ہو گئے۔ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمروں میں روشنی تھی۔ سوچا ماں جلدی جاگ گئی ہوگی۔ اور جاپ کر رہی ہوگی۔ کال بیل کی تو دروازہ ماں نے نہیں مصری لال نے کھولا۔ ایک پل میں اچھے برے کئی خیال ذہن میں گھوم گئے۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو مصری لال؟" میں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

"ماں جی کے پاس آیا تھا حضور۔" اس نے میرا سامان اندر لاتے ہوئے کہا۔

میں لپک کر اندر پہنچا، تو ماں بستر پر بیٹھی تھی۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے اس کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں گھبرا رہے ہو؟"

"مصری لال کو دیکھ کر۔"

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

اتنے میں مصری لال سامان اندر رکھ کر اور دروازہ بند کر کے کمرے میں آگیا۔

"آخر کچھ تو ہوگا۔" میں کرسی کھینچ کر ماں کے پلنگ کے قریب ہوگیا۔

کمرہ بہت گرم تھا۔ باہر کی ٹھٹھرن سے بچ کر کمرے میں آیا تو لگا جیسے دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔

"کٹوری کے لڑکا ہوا ہے ابھی ابھی۔" ماں نے جواب دیا۔

"مبارک ہو مصری لال۔ یعنی دادا مصری لال۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مصری لال میری بات سُن کر اُداس ہوگیا۔

"دائی جھگی میں بیٹھی ہے۔ پچاس روپے مانگتی ہے حُضور۔ تیس روپے میں فیصلہ ہوگیا ہے۔ ماں جی سے روپے مانگنے آیا تھا۔"

"مل گئے؟"

"جی حُضور۔"

"تو جاؤ، دائی کو وداع کرو۔"

مصری لال چلا گیا تو ماں پھر بھی بستر میں ہی بیٹھی رہی۔ بڑی پریشان لگتی تھی۔

"اب کیا پریشانی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"جھگی میں کٹوری کا بُرا حال ہو رہا ہوگا۔ کتنی سردی ہے اور کیسی تیز ہوا ہے۔ جب تُو پیدا ہوا تھا تو تیری دادی نے دس روز تک مجھے کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ پرسُوت میں ہوا نہ لگ جائے۔ کٹوری بیچاری نے تو بیچ جھکڑ میں بچہ جنا ہے۔"

میں نے ماں سے بحث نہیں کی۔ اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہیٹر چلایا۔ کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گیا۔

"چائے پی لو۔ گرم ہو جاؤ گے۔" ماں چائے لے کر آئی تھی لیکن وہ پریشان اب بھی تھی۔

پھر مجھے نیند آگئی اور تین چار گھنٹے گہری نیند سویا۔

دوپہر کو کچھ دیر کے لیے آفس گیا اور پھر لوٹ آیا۔

آکاش میں گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت ہی تیز جھکڑ چل رہا تھا۔

"کیسی ہے تمہاری کٹوری باتو؟" میں نے ماں سے پوچھا۔

"مصری لال کہہ رہا تھا۔ بیچاری کو ٹھنڈ کھا گئی ہے۔"

"اور اس کا بیٹا؟"

"ابھی تو ٹھیک ہے۔ میں نے اُسے کوئلوں کی آدھی بوری لے جانے کو کہہ دیا تھا۔ کوئلے جلانے سے جھگی کی سردی میں کچھ تو فرق پڑے گا۔"

لگتا تھا سردی میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

شام کو زیادہ تیز اور ٹھنڈی ہوا چل پڑی اور پھر بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ ماں نے مصری لال کو بلا کر اپنا ایک پرانا لحاف بھی کٹوری کے لیے دے دیا تھا اور اُسے بہت سی ہدایتیں بھی دے دی تھیں اور پھر کچھ دیر کے لیے اس کے ساتھ جھگی تک ہو آئی تھی۔

رات بادل بڑے زور سے گرجتے رہے۔ بجلی کڑکتی رہی۔ تیز ہوائیں چلتی رہیں اور بارش ہوتی رہی۔ شملہ کی پہاڑیوں پر یقیناً برف گر رہی ہو گی۔

صبح اٹھا تو آسمان ایک دم صاف تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی لیکن کہرے کی گہری تہیں پھیلی تھیں اور کڑا کے کی سردی تھی۔ جھگی میں ایکدم خاموشی تھی۔ آس پاس بھی کوئی آواز نہ تھی۔

اور پھر اچانک ہی ایک زوردار چیخ جھگی کے بے شمار سلاخوں سے نکل کر ہمارے لان میں داخل ہوئی اور پھر ماں کے کمرے میں پہنچی اور اس کے ساتھ ہی مصری لال کی سسکی ایک تیز چھری کی طرح گھر کی خاموشی میں پیوست ہو گئی۔

"میوہ لال کا بھائی مر گیا ماں جی"

"کٹوری کیسی ہے؟"

"بے ہوش پڑی ہے۔"

مصری لال کی آواز سن کر میں بھی ماں کے کمرے میں آگیا۔ وہ ایک لاش کی طرح تک رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ وہاں رُکے رہنا کٹھن تھا۔

اور پھر گہرے نیلے آکاش میں سنہری دھوپ پھیل گئی اور دھوپ کی کرنیں جھگی کی پنچر ملی ہوئی گھاس پر دھیرے دھیرے چمنے لگیں۔ اور پھر میں نے دیکھا مصری لال اپنی باہوں میں مرے ہوئے بچے کی لاش کو سفید کپڑے میں سمیٹے لین سے باہر نکل رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ اُس کا بھتیجا جگ لال تھا۔ اور دو ایک رکشا والے تھے جو اس کے دُکھ میں شریک ہونے کو آئے تھے۔

انسان کی عظمت کی گواہی جھوٹی ہو گئی تھی۔

ایک بیان گُنگ ہو گیا تھا۔

ایک اور ثبوت مِٹ گیا تھا۔

ایک اور سچ جھوٹ میں بدل گیا تھا۔

ایک اور خدا مر گیا تھا۔

لیکن خدا تو دن میں جانے کتنی بار مرتا ہے۔ جب بھی کسی جھگی میں کسی معصوم بچے کی موت ہوتی ہے۔ کسی مل میں کسی مزدور کے ہاتھ کٹتے ہیں، کوئی بے گناہ پھانسی پر لٹکتا ہے۔ کسی سہاگن کی مانگ اجڑتی ہے۔ کسی کھلیان میں آگ لگتی ہے۔ خدا کی ہی تو موت ہوتی ہے وہ۔ اور کون مرتا ہے ؟؟

لیکن خدا مرتا کہاں ہے۔ وہ بڑا سخت جان ہے۔ وہ تو ققنس ہے۔ جو اپنی جلائی ہوئی آگ میں خود جلتا ہے اور جس کی راکھ سے ہزاروں اور ققنس پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس بائی لین میں بارش سے بگڑتی ہوئی جھگی دن دو دن میں سوکھ جائے گی۔ اندر بے سدھ پڑی کٹوری کو ہوش آجائے گا۔ وہ ایک دن پھر اپنی پھٹی ہوئی دھوتی سے اپنے کمزور بدن کو ٹھنڈی ہوا سے بچاتی ہوئی بکائن کی شاخ کی طرح لچک جائے گی اور پھر رت بدل جائے گی اور ٹھنڈی ہوا کی جگہ خوشگوار جھونکے بکائن کی نازک شاخوں کو چھو لیں گے اور ان میں نئی کونپلیں پھوٹ آئیں گی۔

ایسی ہی ایک نئی اور نازک کونپل جھگی کے باہر کھڑی پتلی، لچک دار بکائن کی شاخ سے بھی پھوٹ نکلے گی اور خدا ایک بار پھر اپنی گواہی کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے گا۔

تم میرے سامنے ہو

اکثر ایسا ہوا تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

اُسے جب کہیں دُور اور ٹورسٹ انٹریسٹ کی کسی جگہ جانے کا موقع ملتا، اُس کی بیوی رُوپا بھی اُس کے ساتھ جانے کی ضد کرتی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ سب کچھ طے ہو جانے کے باوجود عین وقت پر کوئی ایسا سانحہ ہو جاتا کہ یا تو اُس کا اپنا پروگرام کینسل ہو جاتا یا رُوپا کسی وجہ سے ساتھ نہ جا سکتی۔ اُس کے اکیلے چلے جانے کے بعد، وہ بے حد اُداس اور تلخ ہو جاتی اور اُس بینک میں بھی، جہاں وہ کام کرتی تھی بے حد کھڑی ہوئی رہتی بینک کے کسی بھی کام میں اُس کا من نہ لگتا۔

ترپاٹھی کو اِندور جانا تھا۔ کوئی انٹراسٹیٹ میٹنگ تھی، کچھ صُوبوں کی تین افسر جانے والے تھے۔ ان سب کی بیویاں بھی ساتھ جانے کا پروگرام بنا چکی تھیں۔ اِندور سے وہ مانڈو اور اُجین جانا چاہتی تھیں اور اگر ممکن ہو سکا تو اُن کا پروگرام ماہُو سے کچھ دُور پر سِدھ جیوتی لِنگ کے درشن کرنے کا بھی تھا۔ لیکن ایک روز پہلے دو افسروں کا جانا کینسل ہو گیا۔ یہاں کچھ ضروری میٹنگز تھیں۔ اب صرف ترپاٹھی رہ گیا تھا جانے کو۔ رُوپا تیار تو تھی لیکن اب اُسے اتنی دُور اکیلی جانا اچھا نہ لگ رہا تھا۔

"اکیلی چلو گی تو تمہیں کوئی اغوا تھوڑی کر لے گا۔" ترپاٹھی نے کہا۔

"تم تو خوش ہو گے، اگر مجھے کوئی لے جائے۔"

"لیکن لے کون جائے گا تمہیں؟"

"ہو سکتا ہے تمہاری تقدیر کھل جائے۔"

"میں اتنا بھاگیہ شالی کہاں ہوں۔"

"اکیلی تو بور ہی ہوں گی۔ تم میٹنگ میں بیٹھے رہو گے۔ میں کیا کروں گی؟"

"اِدھر اُدھر گھوم لینا۔ اِندور خوبصورت شہر ہے۔"
"میں تو مانڈو اور اُجین جانا چاہتی ہوں۔ اِندور میں گھومنا نہیں۔"
"وہاں جا کر ایسا ممکن ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔"
"اِسی لیے میں نہیں جاؤں گی۔"
لیکن ترپاٹھی کے اصرار پر رُوپا جانے کو راضی ہو گئی تھی۔ وہ ستائیس سیکٹر میں جا کر اپنی ماں سے بھی کہہ آئی تھی کہ وہ چار دِن کے لیے اُن کے گھر میں رہے اور ان کی بیٹی وندنا کی بھی دیکھ بھال کرے۔ وندنا تھوڑی دیر بسورنے کے بعد مان گئی تھی۔ اس لئے بھی کہ اُس کے اسکول کا سالانہ فنکشن ہونے والا تھا اور وہ ریہرسل میں مصروف تھی۔

رُوپا نے ساری تیاری کر لی تھی۔ ساتھ لے جانے کے لیے تازہ مٹھیاں بھی بنائی تھیں اور بیسن کے لڈو بھی تیار کر لیے تھے کیوں کہ ترپاٹھی کو بیسن کے لڈو بہت پسند تھے۔ بینک سے اُس نے پانچ دن کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ اگلی صبح دس بجے ڈی لکس بس سے دہلی جانے کا پروگرام تھا۔ یہاں سے اُنہیں شام کو مالوہ ایکسپریس پکڑنی تھی۔
ساڑھے آٹھ بجے کے قریب جب اس نے وندنا کو رکشا میں اسکول بھیجا اور اپنی ماں کو گھر کی چابیاں سونپیں تو اُسی لمحہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بینک کے منیجر کا ٹیلی فون تھا۔ ریسیور بھی رُوپا نے ہی اُٹھایا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر کی بیوی کی ڈیتھ ہو گئی تھی صبح۔ ڈیڈ باڈی جنرل ہاسپٹل میں تھی۔ ریسیور رُوپا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

پچھلی شام ہی تو رنجنا اُن کے گھر آئی تھی۔ رُوپا کو اندور میں اپنی بہن کا ایڈریس دیا تھا اور اُسے کہا تھا کہ وہ اِندور سے چندیری اور مہیشوری کی ساڑیاں ضرور خریدے اور اُس کی بہن کے پاس ہی ٹھہرے، اگرچہ اس کی حامی رُوپا نے نہیں بھری تھی۔ رنجنا کی اچانک موت کی خبر سُن کر ترپاٹھی کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ پانچ سال پہلے ہی تو اُس کی شادی ہوئی تھی۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے وہ بہت ڈپریسڈ رہتی تھی کیوں کہ اُس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ رُوپا اُسے ہمیشہ سمجھاتی تھی کہ یہ ایسی پرابلم نہیں تھی جس کے لیے اُسے اتنا پریشان ہونا چاہیئے۔ لیکن اُس کے لیے تو پرابلم بن گیا تھا اُس کا بانجھ پن۔ اُس کی ساس اُسے ہر دم طعنے دیتی رہتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ گھر میں دُوسری بہو لے آئے گی۔ اگرچہ اس بات پر ماں بیٹے میں کئی بار جھگڑا بھی ہو چکا تھا لیکن گھر میں ایک خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

لیکن رنجنا کی اچانک موت!

یہ سانحہ رُوپا کی سمجھ سے باہر تھا۔ مری بھی وہ اسپتال میں تھی۔ شام کو تو وہ خود اُسے چھوڑ کر آئی تھی اُس کے گھر۔ اُس کا ہسبینڈ اُس وقت گھر پر نہیں تھا۔ صرف ساس تھی لیکن وہ بھی اُس سے بڑی محبت سے پیش آئی تھی۔ رُوپا تو بس روئے ہی جا رہی تھی۔ رنجنا کی موت نے اُسے ایک دم جھنجوڑ دیا تھا۔

ترپاٹھی بھی رُوپا کے ساتھ جنرل اسپتال گیا۔ اُس کا خاوند بے حد پریشان اور نڈھال تھا۔ اس کی ساس بھی

بہت دُکھی تھی۔ رنجنا کی لاش مارچری میں رکھ دی گئی تھی۔ لاش کی سپردگی میں ابھی کچھ وقت لگنا ضروری تھا۔ ترپاٹھی رُوپا کو اسپتال چھوڑ کر گھر آگیا۔ اگر دوسرے دو افسروں کا اِندور جانے کا پروگرام کینسل نہ ہوا ہوتا تو وہ اپنا پروگرام ضرور کینسل کر دیتا۔ رُوپا کی ایک بہت ہی اچھی فرینڈ کی موت ہوئی تھی اور اُسے اُس کے ہسبینڈ کو اس حالت میں چھوڑ کر چنڈی گڑھ سے باہر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

لیکن اُسے چنڈی گڑھ سے جانا ہی پڑا۔ بس بھی اُس نے اس وقت پکڑی جب وہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ بس میں بیٹھے ہوئے بھی اُس کے سامنے رُوپا کا آنسوؤں سے بھیگا ہُوا چہرہ گھومتا رہا اور اس کے کانوں میں رنجنا کے بہت ہی پیارے قہقہے گونجتے رہے۔ رنجنا کی ہنسی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ وہ جب بھی ان کے گھر آتی اپنے پیچھے اپنے قہقہوں کی خوشبو چھوڑ جاتی۔

اِندور میں دو دِن کی انٹراسٹیٹ میٹنگ تھی۔ کئی صوبوں سے افسر آئے تھے۔ بیچ میں اتوار پڑتا تھا۔ اتوار کو لکشری بس میں، دو ایک کو چھوڑ کر سبھی افسر مانڈو گئے تھے۔ ترپاٹھی کا من تو جانے کو نہیں تھا لیکن یہ سوچ کر کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں پڑے پڑے بے کار بور ہوتا رہے گا، مانڈو جانے پر راضی ہو گیا تھا۔ کئی برس پہلے اُس نے رُوپ متی اور باز بہادر کے رُومان پر بنی ایک فِلم دیکھی تھی جس کو مانڈو کی لوکیشن پر فِلمایا گیا تھا۔ جبھی سے اُسے مانڈو دیکھنے کی خواہش تھی۔ رُوپ متی کا محل دیکھنے سے پہلے افسروں کے گروپ نے لجیلہ محل، جہاز محل، ہنڈولا محل، دلاور خاں کی مسجد، ہشنگ شاہ کا مقبرہ، جامع مسجد، اور نیل کنٹھ ایشور جیسی خوبصورت تاریخی جگہیں دیکھیں۔ پھر اُنہوں نے ٹورسٹ بنگلے میں کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ جب وہ لوگ رُوپ متی کے محل کے وسیع کھنڈروں میں پہونچے تو سُورج ڈھل رہا تھا۔ ترپاٹھی کو اِن کھنڈروں میں داخل ہوتے ہی، بہت برس پہلے دیکھی فِلم کے شاٹس یاد آگئے۔

پہاڑی سے بہت نیچے نِماڑ کے علاقے میں میلوں دُور بہتی ہوئی نروداندی اس سطحِ مرتفع سے پانی کی ایک چمکتی ہوئی سفید لکیر سی لگ رہی تھی۔ کتھاکاروں کے اَنوسار اِسی ندی کے کناروں پر رُوپ متی گھوما کرتی تھی اور ساری فضا اُس کے سنگیت کی ہلکی ہلکی پھواروں میں شرابور رہا کرتی تھی۔ رُوپ متی اِنہی کُھلی اور آزاد فضاؤں میں اپنے رُوپ اور یووَن کو نِکھارتی رہی اور اُس کا سنگیت اُس کے حُسن کی حفاظت کرتا رہا۔ اور پھر ایک دن سنگیت کا رسیا مالوہ کا راجہ ملک باز بہادر جو اپنے باپ شجاعت خاں کی موت کے بعد مالوے کے تخت پر بیٹھا تھا، نِماڑ کے علاقے میں، نرودا ندی کے آس پاس شکار کرتے ہوئے، رُوپ متی کی آواز پر موہت ہو گیا۔ ایک فن کار راجہ عوام سے تعلق رکھنے والی ایک فن کارہ کے فن اور سُندرتا پر مر مِٹا اور آخر بہت کوشش کے بعد اسے اپنے حرم میں لے آیا۔

کتھاکاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ رُوپ متی نرودا کی بھگتنی تھی اور صبح جب تک وہ نرودا کے درشن نہ کر لیتی تھی، پانی بھی نہیں پیتی تھی۔ ملک باز بہادر نے اُس کے لیے جو محل بنوایا تھا اُس میں ایک ایسا جھروکا بھی بنوا دیا تھا جس میں سے وہ صبح ہی صبح، بہت نیچے اور بہت دُور بہتی ہوئی نرودا کے درشن کر لیتی تھی اور اپنے سنگیت سے اُس کی آرتی

اُتارتی تھی۔ وہ جھروکا اب بھی موجود تھا اور وہاں سے نرودا ندی کے پانی کی چمکتی ہوئی سفید لکیر اب بھی دُھوپ میں نظر آتی تھی۔ کلا اور سنگیت کے رسیا، رُوپ متی اور باز بہادر اپنے آپ میں اور اپنے فن میں ایسے کھوئے کہ باز بہادر یہ بھی بھول گیا کہ مغلیہ سلطنت مالوے کو اپنے قبضے میں لینا چاہتی تھی اور کئی فوجی جرنیلوں کی نگاہیں اس کے حرم پر تھیں، جس کی دیواریں رُوپ متی کے رُوپ کی چاندنی سے چمکتی رہتی تھیں۔ آخر ایک دِن اکبر بادشاہ کے تین جرنیلوں احمد خاں، محمد خاں اور عبداللہ خاں نے فوج کی ایک بہت بڑی ٹکڑی کے ساتھ مالوے پر چڑھائی کر دی۔ سارنگ پور سے تین کوس کے فاصلے پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اور باز بہادر ہار کر، جان بچانے کے لیے خاندیش کی طرف نکل گیا۔ کتھا کار یہ بھی کہتے ہیں کہ جنگ پر جانے سے پہلے باز بہادر نے اپنے قابلِ اعتماد مشیروں کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر وہ جنگ میں ہار جائے تو حرم کی تمام عورتوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ اس کے مشیروں نے ایسا ہی کیا اور جب احمد خاں اپنے پُر ہوس ارادے سے باز بہادر کے حرم میں داخل ہوا تو اُسے ایک بھی زندہ عورت نہ ملی۔ رُوپ متی تلوار سے کھائے زخموں سے تو نہیں مری تھی لیکن اُس نے زہر کھا کر اپنی جان دے دی تھی اور اپنے پیار اور اپنی عصمت پر حرف نہ آنے دیا تھا۔

کتھا کار یہ بھی کہتے ہیں کہ خاندیش سے لوٹ کر باز بہادر نے ایک بار پھر مالوہ کو واپس لینے کے لیئے اکبر بادشاہ کے جرنیلوں، عبداللہ خاں ازبیگ اور مقیم خاں سے جنگ کی لیکن ہار گیا اور آخر پناہ لے کر وہ اکبر کے دربار میں شامل ہو گیا۔

باز بہادر کی موت ہوئی تو اس کی خواہش کے مطابق اُسے سارنگ پور کے تالاب میں ایک ٹیلے پر رُوپ متی کی قبر کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔

دو عظیم فن کاروں اور پیار کرنے والوں کا یہی افسوسناک انجام تھا!

تر پاٹھی جتنی بھی دیر رُوپ متی کے محل کے مختلف حِصّوں میں گھومتا رہا اور گائیڈ کی زبانی باز بہادر اور رُوپ متی کے پیار کی داستانوں کے چھوٹے چھوٹے قصے سنتا رہا، وہ خود خاموش ہی رہا۔ بہت ہی کم بولا۔ اُس نے بہت ہی کم سوال کیے۔ وہ ہر لمحہ یہی محسوس کرتا رہا جیسے محل کے کھنڈروں کی اونچی اونچی بڑے بڑے پتھروں سے بنی دیواروں پر اب بھی رُوپ متی کے حُسن کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں اور ان سے سنگیت کی لہریں دھیرے دھیرے ٹکرا کر گونج رہی تھیں۔ تر پاٹھی پر جیسے ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

جب وہ اپنے گروپ سے لگ بھگ کٹا ہوا سا، سب سے آخر محل کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو اُسکی آنکھیں نرودا ندی پر ریتی ہوئی شبنم سے بھیگنے لگی تھیں۔ دُور پھیلے پہاڑ کے وسیع میدان کے افق پر سے سورج کہیں بہت نیچے ڈھل گیا تھا۔ اب مالوے کی ٹھنڈی اور مہربان شام، جس کے دنیا بھر میں چرچے ہیں، رُوپ متی کی دھرتی پر اُترنے والی تھی!!

اِندور کے بعد ایک دن کی میٹنگ بھوپال میں بھی تھی۔ یونین کار بائیڈ کارپوریشن کے پلانٹ سے ایک

ہوئی زہریلی گیس کی ٹریجیڈی ہوئے ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تھا لیکن اُس کی تلخ یادیں ابھی لوگوں کے ذہنوں کو کچوک رہی تھیں۔ ترپاٹھی یوں تو اخباروں میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا لیکن بھوپال آکر جب وہ کچھ ایسے لوگوں سے مِلا جو اس المناک حادثے سے متاثر ہوئے تھے تو اسے اندازہ ہوا کہ ۲ دسمبر ۱۹۸۴ء کی رات کو ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک بھوپال کے شہر پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی۔ زہریلی گیس نے بھوپال کے پندرہ کلومیٹر کے رقبہ میں دو لاکھ لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں گھلی ہوئی گیس چولا کانچی اور ریجے پرکاش نگر کی بستیوں میں بنے گھروں میں پہونچی اور لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر شہر کے باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ اس افراتفری کے عالم میں کسی کی گھروالی پیچھے رہ گئی کسی کے بچے چھوٹ گئے۔ موت کی گھڑی میں شاید کسی کو کوئی رشتہ یاد نہیں رہتا۔ اُس وقت سب سے بڑا رشتہ خود اپنی ہی جان کا اپنے سانسوں سے ہوتا ہے۔ باقی سب رشتے ایک پل میں ٹوٹ جاتے ہیں۔

ترپاٹھی جب کسی سے بات کر رہا تھا تو اس آدمی نے کہا تھا۔ "صاحب، بچّوں نے اب کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔ اُن کے بہت سے ساتھی مر گئے ہیں اور ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کے معصوم دماغ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہے کہ آخر یہ ہو کیا گیا تھا؟"

اور بنگلور سے آئے ہوئے ایک افسر نے اِس پر کومینٹ کرتے ہوئے ایمرسن کے الفاظ دوہرائے تھے۔

WHERE IS THE WISDOM WE HAVE LOST IN KNOWLEDGE,
WHERE IS THE LIFE WE HAVE LOST IN LIVING ?

ترپاٹھی اُس رات ریسٹ ہاؤس میں اکیلے لیٹے ہوئے بہت دیر اُداس رہا اور انسانی زندگی کے عارضی پن اور اس کے کچّے دھاگوں جیسے رشتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلے دِن وہ مالوہ ایکسپریس سے ہی دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس سے اگلے دِن نئی دِلّی ریلوے اسٹیشن پر پہونچتے ہی تھوڑی دیر کے لیے ویٹنگ رُوم میں رُکا۔ شیو کی، ہاتھ منہ دھویا، ری فریشمنٹ روم سے منگوا کر ناشتہ کیا اور بس سے چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہو پڑا۔ اس کے من میں بڑی اُتھل پتھل تھی۔

وہ تو بس جلدی سے گھر پہونچنا چاہتا تھا اور رُوپا کو اور اپنی بیٹی وندنا کو صحیح سالم دیکھنا چاہتا تھا۔ ترپاٹھی بغیر کسی واضح اور سپیشٹ کارن کے بے حد پریشان تھا۔ دہلی سے چنڈی گڑھ کے سفر میں اُسے جیسے پانچ گھنٹے نہیں، پانچ دن لگ گئے تھے۔

جب تھری وہیلر اُس کے گھر کے سامنے رُکا تو اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا گیٹ کھولا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے گھر کا نہیں کسی غیر کے گھر کا گیٹ کھول رہا تھا۔ ڈرائیور نے اُس کا سامان گیٹ کے اندر رکھا اور کرایہ لے کر اپنا تھری وہیلر لین میں گھما لیا۔

اس سے پہلے کہ ترپاٹھی کال بیل پریس کرتا رُوپا دروازہ کھول کر خود ہی باہر آ گئی۔

"تم آ گئے!"

"ہاں! خیریت ہے ناسب؟"

"ہاں، خیریت ہے۔"

"اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو تم؟ وندنا ٹھیک ہے ناں؟"

"سب ٹھیک ہے۔"

"جارہی تھیں کہیں تم؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"اُس لڑکی کے پاس۔"

"کس لڑکی کے پاس، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"اُس کے پاس، جس کے باپ نے اُسے رنجنا کی جگہ دینے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"ابھی کریا کرم بھی نہیں ہوا تمہارا رنجنا کا اور اُس کے گھر والے نیا رشتہ بھی منظور کرلیا ہے۔"

"رنجنا کے ہسبینڈ نے؟"

"تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کیا؟"

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں اُس لڑکی کے پاس جارہی ہوں۔ اُسے شادی سے روکنے کے لئے۔"

"کس رشتے سے؟"

"انسانی رشتے سے، معاملہ بڑا سیریس ہے۔"

"انسانی رشتے تو کچے دھاگوں کے سمان ہیں، ان کی کوئی اہمیت نہیں" روپا۔

دونوں بات کرتے کرتے کھلے گیٹ کے نزدیک آ گئے تھے۔ ادھ کھلے گیٹ کے باہر خاموش لین تھی اور گیٹ کے اندر ایک طرف اُس کا سامان پڑا تھا۔

"اگر میں مرگئی تو تم بھی شادی کروگے؟"

"ہر مرد ایسا ہی کرتا ہے۔"

"میں صرف تمہاری بات کر رہی ہوں۔ تریا بھی صرف تمہاری۔" روپا نے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے بُری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں اور کانپتے لہجے میں اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"تم بھی یہی کروگے؟"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔"

یہ سُن کر رُوپا نے اپنی برسات بھری آنکھوں میں دھندلایا چہرہ ترپاٹھی کے کندھے پر رکھ دیا اور اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس نے اپنے کانپتے بازوؤں سے رُوپا کے برسات میں بھیگے چہرے کو اپنے کندھے سے اُٹھایا، اپنے کوٹ کی آستین سے اُسے پُونچھا اور پھر دیر تک اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں رُوپا کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

ترپاٹھی کو لگا جیسے اُس کے سامنے اُس کی بیوی رُوپا نہیں کھڑی تھی بلکہ ایک ہندوستانی عورت کی تصویر اُس کے سامنے تھی۔ اپنی تمام روایات، ساری وفائیں، ہمُوچی رفاقتیں اور بھرپور سماجی مجبوریاں اور خواب لیے۔ وہ خواب جن کی تکمیل میں اُس نے کئی صدیاں گذار دی ہیں۔ جانے کب پُورے ہوں گے ہندوستانی عورت کے خواب؟

جانے کب؟؟ ★★★

طلاق

امین شوگر مل میں کام کرتے ہوئے شرن کو کئی برس ہو گئے تھے۔ مل کے مالکوں سے لے کر بہت بڑے آہنی گیٹ پر تعینات گیٹ کیپروں تک سبھی اُسے جان گئے تھے۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ شرن بڑے حوصلے والا آدمی ہے۔ دیانت داری اور محنت سے کام کرنے کی لگن نے اُسے مزدوروں اور مل کے ذمّہ دار عہدہ داروں میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ وہ دُھن کا پکّا اور ضدّی بھی تھا اس لئے کئی مرتبہ اس کے اصول دوسروں کے اصولوں سے ٹکرا بھی جاتے تھے۔ اصولوں کے اس ٹکراؤ میں وہ چٹان کی مضبوطی کے ساتھ ڈٹ جاتا تھا اور بڑی سے بڑی چوٹ کا ہمّت سے مقابلہ کرتا تھا۔ شرن کے کردار کے یہ پہلو دھیرے دھیرے زیادہ اُجاگر ہوتے گئے۔ جیسے جیسے مزدوروں میں اپنے حقوق کے لئے بیداری پیدا ہوتی گئی۔ وہ شرن کے قریب ہوتے گئے۔ مل کے مالکوں کو اپنے حفاظتی قلعہ میں رخنے پڑنے کا اندیشہ ہونے لگا۔ پرانی قدریں بدل رہی تھیں۔ اقتصادی مشکلات کے بڑھنے سے مزدوروں کے ذہنوں میں بے چینی سی جاگنے لگی۔ اضطراب سا کسمانے لگا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ اُنہیں بھی ایک بہتر اور خوشحال زندگی کی ضرورت تھی۔ ان کے بچّوں کو بھی تعلیم چاہیئے تھی۔ اُن کے گھر والوں کو بھی کھلے آنگنوں، بجلی کے قمقموں اور پکّے گھروں کی ضرورت تھی، اور جب تک اُن کی آمدنی نہیں بڑھتی کچھ نہیں ہو سکتا، اور جب تک مل مالکان ان کے حالات کو بہتر بنانے کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کے بچّے اَن پڑھ اور جاہل رہیں گے، اُن کے گھر والے بیماریوں میں جلتے رہیں گے۔ ان کے آنگنوں میں دھوپ اور چاندنی نہیں پھیلے گی، اُن کی دیواروں پر جمی ہوئی محتاجی کی کالک نہیں دُھلے گی اور اُن کی چھتوں پر دھوپ کے پھول نہیں کھلیں گے، چاندنی کی کلیاں نہیں چٹکیں گی ——— اور جس دن اُنہیں یہ احساس پوری شدت اور پورے خلوص سے ہوا اُسی دن مل میں ہڑتال ہو گئی، اسی دن شرن ایک عام مستری سے ایک مزدور نیتا بن گیا۔

جب ہڑتال ختم ہوئی تو مزدوروں کے لئے کوارٹر بننے شروع ہو گئے، بچّوں کے لئے ایک اسکول کھل گیا۔ مل والوں کی طرف سے ایک ڈسپنسری جاری ہو گئی۔ اور پھر ایک صبح شرن شہر کے ایک کمرے کے گندے سے تاریک

مکان سے اُٹھ کر مِل سے تھوڑی دُور بنے ہوئے کوارٹروں میں سے تیسری قطار کے نکڑ والے کوارٹر میں منتقل ہو گیا، جس میں دو کمرے ایک اسٹور، چھوٹا سا برآمدہ اور دیواروں کی پناہ لئے ہوئے آنگن تھا۔ اس شام ڈیوٹی سے واپس آکر جب اُس نے اپنے لئے کھانا بنانے کی غرض سے چولہا جلایا تو اُسے اپنے چھوٹے بھائی رام داس کا خیال آیا جو گاؤں میں اپنی ماں کے پاس رہ رہا تھا۔ اس نے سوچا اب اُسے اپنی بوڑھی ماں اور جوان بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لینا چاہیئے۔

شرن زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن ذہین تھا۔ جلد باز بھی تھا اسی لئے فیصلے کرنے میں دیر نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ رات کو سونے سے پہلے اس نے اپنے بھائی رام داس کو خط لکھا کہ وہ ماں کو ساتھ لے کر فوراً اس کے پاس چلا آئے۔ جب اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے اس نے سگریٹ سلگایا تو اس کی نظروں نے ایک بار اپنے صاف ستھرے آنگن کا جائزہ لیا، کروٹ بدل کر برآمدے اور کمروں پر نگاہ ڈالی اور پھر آسمان میں تیرتے ہوئے صاف شفاف چاند کو دیکھا اور اُسے دیر تک اسی طرح دیکھتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کے کوارٹروں میں بھی ایسی ہی ٹھنڈی چاندنی پھیل رہی ہوگی اور اس کے ساتھی بھی خوش ہوں گے اور اس طرح سوچتے سوچتے اسے پھر خیال آیا کہ انسانی زندگی کا یہ آنگن کتنا خوب صورت بن سکتا ہے، اس میں پھول بھی کھل سکتے ہیں، گھاس بھی اُگ سکتی ہے، بچوں کے قہقہے بھی گونج سکتے ہیں اور عورتوں کی چوڑیاں بھی کھنک سکتی ہیں۔ زندگی جینے کے قابل بھی بن سکتی ہے۔ اور اُس نے یوں سوچا تو اُس کے جلتے ہوئے سگریٹ کے آخری حصے پر جمی ہوئی اُنگلیوں کو ہلکے سے سینک کا احساس ہوا۔ اور اُس نے سلگتے ہوئے سگریٹ کو دُور پھینک دیا۔ اس کے دل دماغ میں تسکین اور اطمینان کے پھول کھل اُٹھے۔

کچھ روز کے بعد جب اس کی ماں اور اس کا بھائی رام داس آ گئے تو اُس کی زندگی کا معمول ہی بدل گیا۔ وہ جو برسوں سے اکیلا پن اس کی زندگی میں سما گیا تھا کم ہونے لگا تھا اب برابر کے کوارٹروں سے عورتیں اس کی ماں سے ملنے آتی تھیں ورنہ اب تک تو اس کے گھر میں کسی عورت نے قدم تک نہ رکھا تھا۔ وہ چاہتا تو ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اُس کے متعلق سوچا بھی نہ تھا اور وہ اب ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ کسی کو اپنی عمر کے لمحوں میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی سپاٹ زندگی میں کسی آنچل کا سایہ نہ لہرایا تھا۔ اس ریگ زار میں محبّت کا ایک بھی پھول نہ کھلا تھا۔ اس کی عمر پینتیس ۳۵ کے لگ بھگ تھی، جو یوں کچھ بہت زیادہ بھی نہیں، لیکن اس کے جذبات میں گرمی نہیں تھی۔ اور اس کے احساسات میں کسمساہٹ نہ تھی۔ پہلے پہل تو اُسے ماں کے اور رام داس کے آ جانے سے کچھ کوفت بھی ہوئی۔ اپنے پھکڑپن میں یہ مداخلت اُسے کچھ چُبھی لیکن پھر اُس نے سمجھوتہ کر لیا۔ اس نے ایک کمرہ ماں اور رام داس کے حوالے کر دیا اور دوسرے کمرے میں اپنا سارا اکیلا پن سمیٹ کر گھس گیا۔ اب وہ اکیلا تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے لیٹ کر وہ سب سے الگ تھلگ ایک ویران جزیرے میں جینے لگتا۔ اور جب دروازہ کھول دیتا تو اس کے اِردگرد زندگی کی بانہیں پھیل جاتیں، ماں کا پیار اور بھائی کی محبت اس کی تنہائی کو آباد کر ڈالتیں۔ اب اُسے چائے کی پیالی پینے کے لئے کوارٹروں کے پاس ایک ٹوٹے پھوٹے ٹی۔ اسٹال میں نہیں جانا پڑتا تھا۔ بستر پر بیٹھے

لیٹے ہی رام داس اُسے چائے کی پیالی لا دیتا تھا، جسے وہ سگرٹ کے دھوئیں کے ساتھ گھونٹ گھونٹ کرکے پیتا رہتا تھا۔ اب اسے کھانا بنانے کے لئے چولہا نہیں پھونکنا ہوتا تھا۔ ماں تھال میں کھانا پروس کر اس کے سامنے رکھ دیتی تھی۔ وہ جب اپنی شفٹ ختم کرکے آتا تھا تو اُسے دِیا جلا کر گھر کا تالا نہیں کھولنا پڑتا تھا۔ ہاتھ کی ذرا سی دستک پر ماں مسکراتے ہوئے شفیق چہرے کی جوت بکھیرتے ہوئے دروازہ کھول دیتی تھی اور راس کے من میں پیار کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے۔

کچھ مہینے کے بعد اس نے رام داس کو بھی شوگر مل میں نوکر کرا دیا۔ جس دن رام داس پہلی تنخواہ لے کر گھر آیا تو ماں نے سارے کوارٹروں میں لڈو بانٹے اور رات کو اپنے آنگن میں کیرتن کرایا۔ رات گئے تک شرن اپنے دوستوں میں میٹھا خوش گپیاں کرتا رہا اور جب وہ گھر آیا تو بے حد خوش تھا۔ ماں نے پہلی بار اس سے شادی کر لینے کے لئے کہا، جسے اُس نے ہنس کر ٹال دیا اور کہا "میں نے شادی کرکے طلاق بھی لے لی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں نے اپنی تنہائی سے بیاہ کر لیا تھا اور جس روز تم نے یہاں قدم رکھا، وہ مجھے چھوڑ گئی، تم نے میرے اتنے برس کا گرہست اُجاڑ دیا ہے۔" اور راس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور رام داس نے کروٹ بدل کر اپنے بھائی کو بڑی محبت سے دیکھا۔

"شادی کے بِنا جیون ادھورا رہ جاتا ہے۔ شاستروں میں پتنی کو اردھ انگنی کہا گیا ہے ـــــ منش کا آدھا شریر۔" ماں نے بڑے گیان کی بات کہی تھی۔

"لیکن کچھ جیون تو شادی کے بعد بھی ادھورے رہتے ہیں۔ کس بکھیڑے میں پڑ گئی ہو۔ اب تو تم رام داس کی شادی کی فکر کرو۔ تیس برس کا ہونے والا ہے۔" بھائی کی بات سن کر رام داس نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور کے جزیروں میں کھو گیا۔

کارتک کی آخری تاریخوں میں رام داس کی شادی طے ہو گئی۔ مل کے مالکوں، عہدہ داروں اور مزدوروں سبھی نے شرن کا ہاتھ بٹانا چاہا، لیکن اس نے سوائے اپنے بونس کے مل کے مالکوں سے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ ساتھی مزدوروں نے جب کچھ خرچ کرنا چاہا تو بھی اُنہیں روک دیا۔ رام داس کا بھی ایک پیسہ نہ لگنے دیا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے رام داس کی شادی پر خرچ کر دیا۔ لوگ واہ واہ کر اُٹھے۔ جس شام دُلہن گھر میں آئی وہ بھول گیا کہ اس کی عمر پینتس ۳۵ سے اوپر تھی اور راس نے زندگی کو بڑی بے نیازی سے گذارا تھا اور اس کی تنہائی ہی اس کی واحد ساتھی تھی۔ اُسے صرف ایک بات یاد رہی کہ کرشنا کو اس نے خود رام داس کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ بڑی سگھڑ لڑکی تھی، خوبصورت تھی اور میٹرک پاس تھی۔ اور یہی بات اُسے اس وقت یاد تھی جب برات لڑکی والوں کے گھر پہونچی تھی اور وہ ڈھول کے ساتھ کئی ساتھی مزدوروں کی ٹولی میں شامل ہو کر بھانگڑہ ناچ رہا تھا۔ اور اس وقت اُس کی شملے دار پگڑی کھل گئی تھی اور اُس کے کانوں میں اُڑسا ہوا عطر سے لبریز روئی کا گالا نیچے گر گیا تھا اور اس کے دماغ میں صرف خوشبو ہی خوشبو تھی وہ خوشبو ابھی تک اُس کی روح کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اُسے

نشے کی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا اور اسی کیفیت کے زیر اثر وہ چھت کی منڈیروں، آنگن کی دیواروں اور دروازوں کی چوکھٹوں پر موم بتیاں جلائے جا رہا تھا۔

اس رات وہ اپنے کوارٹر سے باہر سامنے کھلے میدان میں چارپائی ڈال کر سویا۔ جب تک اس کی آنکھ نہیں لگی وہ موم بتیوں کی جھلملاتی ہوئی لوؤں کو تکتا رہا، چاند کی چاندنی، اور ہوا کی تازگی کو پیتا رہا۔ اور پھر اسے اپنے کمرے کا خیال آیا جس پر انجانے ہی میں رام داس اور کرشنا کا قبضہ ہو گیا تھا ـــــ وہ کمرہ جس میں اس نے اپنی تنہائی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا، اس سے چھن گیا تھا۔ اور اسے ذرا بھی ملال نہ ہوا تھا۔ اب وہ تنہا تھا ہی کہاں؟ اب تو اس کے ساتھ زندگی کا ایک پورا کارواں تھا۔

کارتک کے بعد مہینہ بھر سے زیادہ شرن اپنے کوارٹر کے سامنے کھلے میدان میں رات کو سوتا رہا۔ دن میں وہ گھر صرف کھانا کھانے ہی آتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی آزاد اور کھلی زندگی میں کئی طرح کی پابندیاں لگ گئی ہیں جیسے اپنے ہی گھر میں وہ ایک اجنبی ہو گیا ہو۔ پوس کا مہینہ شروع ہو گیا اور اس کے سوا کوئی آدمی بھی باہر سونے والا نہ رہا۔ تو اس کی ماں اور رام داس دونوں نے اسے اندر سونے پر مجبور کیا۔ اس کے پاس انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، اس لئے ایک رات جب رام داس اس کی کھاٹ باہر میدان سے اٹھا کر اندر لے آیا تھا تو وہ خاموش رہا۔ اور جب اس کا بستر اس کمرے میں لگ گیا جو اس کا اپنا کمرہ نہیں تھا اور جس میں ماں رہتی تھی اور جس میں پہلے رام داس بھی رہتا تھا تو وہ چپ رہا اور جب رام داس نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا اور ماں نے بتی بجھا کر اپنا کمرہ بھی بند کرنا چاہا تو شرن بول اٹھا، "دروازہ کھلا رہنے دو۔"

"ٹھنڈی ہوا آئے گی اندر بیٹا!"

"برف تو نہیں گرے گی!"

ماں نے کچھ نہیں کہا اور دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماں سو گئی۔

تمام رات دروازہ کھلا رہا اور اس کے ساتھ ہی شرن کی آنکھیں بھی کھلی رہیں۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آتے رہے لیکن اس کی کھلی آنکھیں جیسے جلتی رہیں۔ اسے ایسا لگا کہ کرشنا کے آنے سے اس کی اپنی انفرادیت جیسے ایک دم ختم ہو گئی تھی۔

مل کے مالکوں نے ایک نئی شوگر مل کانپور میں کھولنے کا فیصلہ کیا۔ شرن اب ایک معمولی مستری سے ہیڈ مستری ہو گیا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور مرتبہ بھی۔ مل کے قواعد کے مطابق شادی کے بعد رام داس کو بھی ایک کوارٹر الاٹ ہو سکتا تھا۔ کچھ نئے کوارٹر بن بھی گئے تھے۔ لیکن رام داس الگ رہنے پر راضی نہ ہوا تھا۔ شرن کو یہ بات اس لئے اچھی لگی تھی کہ اس کی طبیعت سے میل کھاتی تھی۔ ماں نے بھی اس فیصلے کو پسند کیا تھا۔ وہ سوچتا، لوگ کیا کہیں گے کہ چھوٹے بھائی کی شادی کر کے شرن نے اسے نکال دیا۔ لیکن کرشنا اس بات سے بہت خوش نہیں تھی وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس کے دل میں اپنا ایک گھر بنانے کی چاہ تھی ـــــ اپنا گھر جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ جس کے دروازے

پر رام داس کے نام کی تختی لگی ہو، جس کے کمروں میں اُس کے جہیز کی چیزیں سجی ہوں۔ اب تو وہ سب ایک بڑے سے ٹرنک میں بند پڑی تھیں۔ صرف دو پلنگ تھے جو استعمال میں آ رہے تھے اور وہ بھی شرن کے کمرے میں۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ اُسے کسی بھی چیز پر وہ حق نہیں جو ایک بیاہتا عورت کو ہوتا ہے اُس نے کئی بار رام داس سے کہا بھی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا پھر اس نے ماں سے بھی شرن کی تکلیف کا ذکر کیا، جس کے لئے گھر میں عزت سے بیٹھنے کی بھی جگہ نہ رہی تھی۔ لیکن ماں نے یہی کہا تھا، "اب تمہارے علاوہ کسی کا بھی گھر نہیں، تم اُسے جس طرح چاہو استعمال کرو۔"

"لیکن دو کھاٹ کی جگہ کو کس کس استعمال میں لا سکتی ہوں؟"

"بہو! اکٹھے رہنے میں بڑی عزت ہے اور پھر ہمارے خاندان میں تو کوئی الگ ہوا ہی نہیں۔"

"ماں جی یہ پُرانے وقتوں کی باتیں ہیں، اب زمانہ بدل گیا ہے۔"

"زمانہ لاکھ بدل جائے، دل نہیں بدلنے چاہئیں۔"

اب کرشنا کیسے کہہ سکتی تھی کہ اُس کا دل بھی بدل گیا ہے۔

اس طرح ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا۔

کرشنا نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ اس واقعہ نے ایک بار پھر گھر باہر کو خوشی اور امرت سے نہلا دیا۔ جو چھوٹی چھوٹی دراڑیں دیواروں پر کُھل گئی تھیں، وہ ایک بار پھر بھر گئیں، اور انسانی رشتے ایک بار پھر آپس میں گتھ گئے۔ شرن خوش تھا۔ اب اس کی زندگی کا قافلہ دو میل اور طے کر گیا تھا، اس کی عمر میں دو اور برسوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ اور اس کے ساتھ گھر سے اُس کا تعلق پہلے سے زیادہ گہرا ہونے لگا تھا۔ اب اُسے کوئی حسرت نہیں تھی۔ اس بچے کے جنم کے بعد اُسے اپنے ارادوں کی تکمیل کا احساس ہونے لگا تھا۔

جس روز کرشنا گیارہ دن نہا کر باہر آنگن میں بیٹھی، شرن نے بچے کو اُٹھا کر جانے کتنی ہی بار چوما، اُسے سینے سے لگایا، بے شمار دعائیں دیں، گھونگھٹ کاڑھے، سر جھکائے بیٹھی ہوئی کرشنا سے کہا، "کرشنا، جتنا میں آج خوش ہوں، شاید اتنا خوش کبھی نہیں ہوا۔ بچہ ہزار برس جئے۔"

سامنے کھڑی ہوئی ماں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اُس نے شرن سے بچے کو لے کر کرشنا کی گود میں لٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شرن مل میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی آسمان پر بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جھاجوں مینہ برسنے لگا اور اولے گرنے لگے۔ شام کو جب شرن اور رام داس واپس آئے تو بچے کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ پہلے ڈسپنسری سے ڈاکٹر آیا۔ پھر شہر سے ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ شرن تمام رات پاگلوں کی طرح ڈاکٹروں کو اکٹھا کرتا رہا۔ جب صبح کی پہلی کرن پھوٹی تو اس کے گھر کا سورج غروب ہو گیا۔

شرن جب رام داس کے ساتھ بچے کو شمشان میں دفنا کر گھر لوٹا تو وہ خود ادھ مرا ہو چکا تھا۔ وہ آنگن میں کھڑا دیر تک روتا رہا اور پھر اندر آ کر چارپائی پر چت گر گیا۔ سب سسکتے روتے، بھوکے پیاسے، تھک ہار کر اپنی اپنی

چار پائیوں پر گر گئے۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور شرن کھلی آنکھیں چھت پر گاڑے اندھیری رات میں چراغ کی طرح سُلگ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھ کر برآمدے میں آیا کہ دل کی گھبراہٹ ذرا سنبھلے۔ ساتھ والے کمرے سے کرشنا کی آواز آرہی تھی۔ "میرے بچے کو تمہارے بھائی نے مارا ہے۔ تمہارا بھائی میرے بچے کا قاتل ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ فوراً کمرے میں لوٹ آیا، اس میں کچھ اور سننے کی تاب نہیں تھی۔ تمام رات سرد اور تیز ہوا چلتی رہی اور تمام رات شرن دُکھ اور درد کی آگ میں جلتا رہا۔

اس واقعہ کے بعد رام داس خاموش رہنے لگا۔ وہ اپنے بھائی اور ماں سے بہت کم بولتا، بلکہ ان سے کترا جاتا۔ کرشنا سارے دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ ماں الگ بیٹھی روتی رہتی اور شرن اندر ہی اندر پگھلتا رہتا۔ اور اس آگ میں گھر کے تعلقات، بھائیوں کا پیار، ماں کی ممتا اور زندگی کی عظمت اور خوب صورتی جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور تعلقات کی جلی ہوئی راکھ اِدھر اُدھر بکھرنے لگی۔ چہرے دُھندلانے لگے، جذبات کُمھلانے لگے اور گھر کے آکاش پر ایک ایسی گھٹا چھا گئی جو نہ کُھلتی تھی نہ برستی تھی۔

شرن نے ایک دن مل کے مالکوں سے کہہ کر اپنا تبادلہ کانپور کی نئی شوگر مل میں کرا لیا جو اب چالو ہونے والی تھی۔ مالک خوش تھے کہ ان کا ایک بہت ہی اچھا کارندہ نئی مل کو چلانے کے لئے اپنی مرضی سے جا رہا تھا۔ انہوں نے تنخواہ بڑھانے کو کہا تو شرن نے انکار کر دیا۔ اس شام کو جب اس نے گھر آکر کانپور جانے کی اطلاع دی تو اسے محسوس ہوا کہ ماحول بدل گیا تھا۔ مدت سے چھائی ہوئی کالی گھٹا برس پڑی تھی۔

اُس شام اس نے پہلی بار کرشنا کو خوش دیکھا، پہلی بار رام داس نے اس سے محبت سے بات کی۔ ماں پر اس کا اثر کیا ہوا تھا، اس پر شرن نے دھیان نہیں دیا۔ اس نے سوچا، وہ چلا جائے گا تو یہ کوارٹر رام داس کو مل جائے گا۔ ماں کو وہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور کرشنا اس کو اپنا گھر سمجھ کر آزاد اور خوش رہے گی۔ اس کا وہ سب کچھ سامان جو ایک بڑے سے ٹرنک میں بند تھا کمروں میں سجے گا اور کرشنا کے زمزمہ قہقہے پانی کی طرح بہہ نکلیں گے، دھوپ میں چمکیں گے اور رام داس ان سے فرحت اور راحت محسوس کرے گا۔

اس رات کرشنا اور رام داس واقعی اپنے نئے گھر کے رنگین نقشے بناتے رہے۔ ماں خاموش پڑی رہی شرن بے کار کی باتیں سوچتا رہا۔

اب کرشنا خوش تھی۔ رام داس خوش تھا۔ ماں خاموش تھی۔ اور شرن بے نیاز تھا۔

لیکن پھر فضا اچانک بدل گئی۔ مشینری کے پہنچنے میں دیر ہوگئی اور نئی شوگر مل کے فوراً چالو ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ مل کے منیجر نے ایک شام شرن کو دفتر میں بلا کر کہا کہ اس کا کانپور بھیجا جانا ممکن نہیں تو اس کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، سر جھکائے باہر آگیا۔ اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ رام داس اور کرشنا کی خوشیوں کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک مجرم تھا۔ اسی اُدھیڑ بن میں جب وہ گھر پہنچا اور دروازے پر دستک دینے لگا تو اس کے کانوں میں کرشنا کے مترنم قہقہے گونجے، جیسے جمی ہوئی برف پگھل کر نالے کی شکل میں بہنے لگی تھی۔ اور ماحول میں سنگیت پھیلا رہی تھی۔ جس

ے رام داس لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ماں شاید گھر میں نہیں تھی۔ نالے کے بہاؤ کو کوئی چٹان نہیں روک رہی تھی۔ اس نے سوچا، وہ خود یہ چٹان کھڑی نہیں کرے گا۔ تاکہ کرشنا کے قہقہوں کا ساگر چھلکتا رہے۔

وہ دروازے سے ہی لوٹ گیا اور اس طرف نکل گیا جہاں مل کے نئے کوارٹر بن رہے تھے۔ شرن ان کوارٹروں میں گھومتا رہا ــــــ نامکمل عمارتیں جن میں صرف اکیلاپن، اندھیرا اور تنہائی بس رہی تھی۔ اُسے نہ جانے کیوں وہاں بے حد سکون کا احساس ہوا۔ جب وہ رات کو گھر لوٹا تو بڑا سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اس نے زندگی کی گہرائیوں میں کھو کر جانے کون سے موتی اکٹھے کر لئے تھے۔ سونے سے پہلے وہ کمرے کی ہر ایک چیز کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتا رہا اور جب سو گیا تو اس کے ذہن کے کواڑ آپس میں ٹکراتے رہے۔

اگلی صبح اس نے زیرِ تعمیر، نامکمل اور آبادی سے دُور نئے کوارٹروں میں سے اپنے نام ایک کوارٹر الاٹ کرنے کی درخواست دے دی۔ اس نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی، کسی سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے چہرے پر عزم کے نشان اور آنکھوں میں سنجیدگی کی گہرائیاں تھیں اور جب وہ گھر لوٹا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی عمر بھر کی ساتھی تنہائی جس کو اس نے اپنے پاگل پن سے ایک دن طلاق دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا، ایک بار پھر واپس آ گئی تھی اور ڈیوڑھی پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اپنی ساری رعنائی اور خوب صورتی کے ساتھ ایسی خوب صورتی جو تنہائی کے ماتھے پر سہاگ کی بندی ہے۔

ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کرچیاں

تمام دن باغ کے مختلف حصّوں میں گھومتا رہا ہوں۔ اکیلا خیالات میں ڈوبا ہوا۔ ایکدم کھویا ہوا سا، جیسے ان ڈھیر سارے لوگوں کا احساس ہی نہ تھا۔ جو اتنی خوبصورت دھوپ میں گہرے نیلے آسمان کی نیلاہٹ میں چنڈی گڑھ سے بھاگ کر پنجور کے مُغل گارڈن میں کچھ گھڑیاں ہنس کھیل کر گذارنے آئے تھے۔ اتنی ساری بھیڑ میں بالکل تنہا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے بھی الگ۔ ایک ایک پیڑ کے پاس گیا تھا۔ لیچی کے ہر ایک درخت کو سلام کیا تھا۔ چیکو کے پکے پھلوں کی سختی کو محسوس کیا تھا۔ چھو کر، دبا کر، جیسے میں نے زندگی کی حسین ساعتوں کو اپنے ہاتھوں سے بھینچا تھا اور اپنے سینے سے لگایا تھا۔ سامنے سُورج پور کی سیمنٹ فیکٹری کی دو اونچی اونچی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس خاموشی سے جیسے آنکھوں سے آنسو رستے ہیں۔ جیسے یہ دو چمنیاں ان پہاڑیوں کی آنکھیں ہیں۔ جن سے ان کے سرد، نرمل اور شتیل آنسو بہے جا رہے تھے۔ جیسے یہ کبھی نہ رکیں گے۔ سدا بہتے رہیں گے۔ اور ان کا پانی پاس بہتے ہوئے چھوٹے سے پہاڑی نالے میں مدغم ہوتا رہے گا۔ یہ دن رات اگلا جاتا ہوا دھواں فضا میں اس طرح رچ رہا تھا جیسے یہ بھی اس کا ایک حصّہ ہو۔ یہ سارا دھواں فضا میں جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے؟ جانے کہاں؟ سامنے کسولی نظر آ رہی تھی۔ اس کے مکانوں کی سُرخ چھتیں دور سے بڑی خوبصورت لگتی تھیں۔ پہاڑیوں سے گھری ہوئی یہ چھوٹی سی جگہ کتنی اچھی ہے۔ موسم سرما کے کھلے ہوئے پھول کیسی بہار دے رہے تھے۔ ہر قطعے میں ٹولیاں جمی تھیں۔ نسوانی قہقہے گونج رہے تھے۔ رنگ برنگ ساڑھیاں چمک رہی تھیں۔ کالے گھنے، لمبے گیسو لہرا رہے تھے۔ گلابی ہونٹوں کی پنکھڑیاں کھل رہی تھیں۔ زندگی جوان ہو رہی تھی۔ شگفتہ ہو رہی تھی۔ پروان چڑھ رہی تھی اور میں اس ماحول میں ایکدم اداس باغ کے کونوں میں گھوم رہا تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ وہی بیکار سی باتیں جنہیں سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ شتیل مجھے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ شتیل میرے اس دوست کی بیوی ہے جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اسے بھابی کہہ کر پکارتا ہوں اور وہ مجھے واقعی ایسا سمجھتی ہے جیسے میں رمیش کا بھائی ہوں۔ جب کبھی تین چار مہینے کے بعد کسی کام سے چنڈی گڑھ جاتا ہوں تو رمیش سے زیادہ خوشی بھابی کو ہوتی ہے۔ ان کا ایک بچّہ ہے۔ میں پہنچوں تو وہ تالیاں بجا بجا کر میرا سواگت

کرتا ہے۔ ایک بچے کے لئے دوسرے بچے کو دیکھ کر خوش ہونا عین قدرتی ہے۔ بچپن کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ پچاس برس کی عمر کا ایک شخص بھی بچہ ہو سکتا ہے اور پانچ برس کا بھی۔ میں جب آم کے ایک درخت کے سہارے کھڑا ہو کر سگریٹ سلگانے لگا تو شتیل کی آمد سے چونک پڑا۔

"بھائی صاحب! کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟"

میں پل بھر کے لئے چونک پڑا۔ جیسے میں یوں پکڑے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

"میں؟"

"ہاں ہاں آپ، وہاں سب لوگ انتظار کر رہے ہیں اور آپ دو گھنٹے سے غائب ہیں، یہ کیا شرافت ہے۔"

"بھابی میں شریف آدمی نہیں ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے آپ جو کچھ ہیں، چلیئے" اور بھابی نے میرا بازو پکڑ کر چلنے کے لئے مجھے دھکیلا۔

"میں آج پریشان ہوں۔ مجھے تنگ کرو گی تو میں رو پڑوں گا۔"

"رو پڑوں گا، بڑی شان کی بات ہے رونا۔" اس نے میرا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"شان کی بات تو مجھ میں کوئی بھی نہیں بھابی۔" وہ مجھے دھکیلے جا رہی تھی اور میں دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر ہمارے سب ساتھی تالیاں بجا کر ہمارا سواگت کرنے لگے۔ رمیش کا بچہ بھاگ کر میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے انکل؟"

"جہنم میں۔"

"تو اب جنت میں کیوں لوٹ آئے ہو۔" رمیش نے کہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سبز سبز گھاس پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن دکھاوے کے لئے کھانا ہی پڑا کیونکہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔

"یوں منہ لسورے کیوں بیٹھے ہو۔ کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی تمہیں؟"

اب میں ان لوگوں کو کیا بتاتا کہ مجھے یہ اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ میں ہنستے ہنستے ایکدم اداس کیوں ہو جاتا ہوں۔ چلتے چلتے ایکدم کیوں رک جاتا ہوں۔ سوتے ہوئے اچانک چونک کیوں پڑتا ہوں — یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں۔ انہوں نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ شاید ان سب نے شکستیں کھائی ہوں گی لیکن انہوں نے اپنے دل کے زخم مندمل کر لئے ہیں۔ ان سب نے محبت کی ہوگی۔ اس میں انہیں داغ بھی ملیں ہوں گے۔ لیکن اب وہ داغ جلتے نہیں۔ انہوں نے سرد جذبات کی برف رکھ رکھ کر ان کی جلن کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ ان کے خواب بھی شاید کبھی اجڑے ہوں گے۔ لیکن گرے ہوئے محلوں کی گرد ان کی آنکھوں کی پتلیوں کو غبار آلود نہیں کر رہی۔ گرد دھیرے دھیرے چھٹ گئی ہے یہ سب لوگ وہ ہیں جو زندگی کا مقابلہ نہیں کرتے۔ اس کی شرطیں مان کر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ یہ سب بڑے خوبصورت

لوگ ہیں، بڑے پیارے، بہت پرخلوص، لیکن ضرورت سے زیادہ متوازن۔ یہ کبھی نہ سمجھ پائیں گے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تمام زندگی غیر متوازن رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پاسنگ جس کے پلڑے میں ڈالنے سے ترازو کی ڈنڈی سیدھی رہتی ہے، کہیں کھو گیا ہے۔ حالات کے اتنے بڑے کباڑ خانے میں۔ اور جب تک پاسنگ نہیں ملتا، ترازو کی ڈنڈی ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اس لئے کہ وہ کسی بے کار پڑے ہوئے پتھر کو پاسنگ کی جگہ استعمال نہیں کر سکتے۔ بس یہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

یہ کیپٹن کی بیوی جو ہمارے گروپ میں ہے، تمام دن اپنے خاوند سے جھگڑتی رہتی ہے کہ وہ سگریٹ کیوں پیتا ہے۔ اور میں اسے سگریٹ پلاتا رہا ہوں اور اس کی بیوی مجھے یوں دیکھتی رہی ہے جیسے اس کا بس چلے تو میرا اگلا گھونٹ دے۔ میں اسے چڑانے کے لئے بار بار اپنا سگریٹ کیس کھولتا ہوں اور پھر بند کر دیتا ہوں۔

کیپٹن کو شعر سننے کا بڑا شوق ہے۔ ہم باتیں کرتے کرتے وہاں سے اٹھ کر ایک طرف چل دیئے۔ ایک بڑے خاموش سے کونے میں جہاں پانی کی ہلکی سی لکیر سیدھی کھنچی جا رہی تھی۔ چشمے کا صاف پانی آہستہ آہستہ بہے جا رہا تھا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ کیپٹن کی بیوی کو خیال تھا کہ اس کا خاوند صرف سگریٹ پینے کے لئے میرے ساتھ آ گیا تھا۔ ادھر رمیش نے اسے بچ دی تھی اور وہ ہمیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ پہنچی تھی جہاں ہم بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور شعر پڑھ رہے تھے۔ کیپٹن نے بیوی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سگریٹ ایک طرف پھینک دیا، لیکن منہ میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو اس کی بیوی نے دیکھ لیا تھا۔

"پھینک کیوں رہے ہیں سگریٹ، میں نے دیکھ لیا ہے۔"

"میں کہاں پی رہا ہوں سگریٹ، یہی پی رہے ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا جلایئے اپنے آپ کو۔ واپس جالندھر چلئے پھر نپٹوں گی آپ سے۔"

"یہیں کیوں نہیں نپٹ لیتیں؟" رمیش اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، بولا۔

میاں بیوی آپس میں جھگڑنے لگے۔ کیپٹن نے اُسے ڈانٹا بھی۔ میں ایک طرف کھڑا سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ اور نیا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ کیپٹن کی نسبت اس کی بیوی کی آواز اونچی تھی۔ میں وہاں سے دھیرے سے کھسک گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی لو میرج تھی۔ ایک جوڑا ہاتھ میں ہاتھ دیئے اپنے آپ میں مگن سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ لڑکی کی سُرخ رنگ کی ساڑھی کا تلے سے کڑھا ہوا بارڈر دھوپ میں عجیب انداز سے چمک رہا تھا۔ وہ پاس سے گزری تو خوشبو کی ایک ہلکی سی لہر فضا میں تھرتھرا گئی۔ جیسے وہ اپنی یادیں باغ کے حسین ماحول میں چھوڑے جا رہے ہوں۔ اُدھر ایک کونے میں کچھ براتی لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ انہوں نے شلواریں اوپر اُڑس رکھی تھیں۔ اور ان کی گوری گوری پنڈلیاں پھولوں کے درمیان سبز گھاس پر بھاگتے ہوئے بڑی سُندر لگ رہی تھیں۔ ان کے سینوں میں خوابوں کے سنسار بسے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نئی جوانیوں کے خمار تھے اور ان کے ہونٹوں پر شفق کی سرخی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ادھر کوئی لڑکی گا رہی تھی۔ کوئی بنگالی گیت تھا، میں ایکدم

رُک گیا۔ بنگلہ مجھے نہیں آتی۔ تھوڑی تھوڑی سمجھتا ہوں۔ لیکن ٹیگور اور نذرالاسلام کی زبان کے گیت مجھے سدا ہی اچھے لگتے ہیں۔ خدا کرے تمہاری آواز کا یہ رس تمام زندگی قائم رہے۔ تمہارے گلے کا یہ لوچ کبھی نہ ٹوٹے۔ تمہاری زندگی میں سدا بہار رہے۔ ان پھولوں کی طرح جو اس باغ میں کھل رہے ہیں۔ میں یہ دعا دے کر سیڑھیاں اتر کر آگے نکل گیا۔ سورج پور کی سیمنٹ فیکٹری اپنا گاڑھا اکیلا دھواں بڑی گمبھیرتا اور سنجیدگی سے فضا میں اگل رہی تھی۔

اس کے بعد میں اپنے گروپ میں شامل نہیں ہوا۔ شام کی چائے پر انہوں نے یقیناً میرا انتظار کیا ہوگا۔ شاید ڈھونڈا بھی ہو لیکن میں اپنے من پر اپنے ماضی کی لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا بوجھ لئے باغ کے سب حصے طے کرتے ہوئے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے باہر آ گیا تھا۔ میں نے وہاں کی پرائیویٹ کینٹین سے ایک گلاس چائے لی اور اس گہرے نالے کی پتھروں کی بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ گیا۔ جس کا پانی ایک چھوٹی سی آبشار کی شکل میں گر کر بے ترتیب پڑے ہوئے پتھروں سے ٹکراتا ہوا بہے جا رہا تھا۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں لئے لوگوں کو دیکھتا رہا جو اپنی خالی ٹوکریاں اور تھکے ہوئے جسم لئے باغ کے بڑے سے دروازے سے باہر آ رہے تھے۔ واپس چنڈی گڑھ جانے کے لئے۔ اور پھر آخری بس آئی۔ تھوڑی دیر رکی اور سواریاں بھر کر چلی گئی۔

میلہ چھٹ گیا۔ زندگی کا ایک خوشگوار دن ختم ہو گیا۔ زندگی کے دن اسی طرح غیر محسوس طور پر گزرتے رہتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ لیکن کوئی لمحہ جاتے جاتے کوئی ایسی چنگاری پھینک جاتا ہے کہ صدیوں تک سینے میں دل جلتے رہتے ہیں۔ یہی زندگی ہے۔ پہاڑی نالے میں بہتے ہوئے پانی کی طرح بہے جا رہی ہے۔ مست، مگن اور بے نیازنہ۔

میں نے خالی گلاس کینٹین والے کو واپس کیا اور پنجور کے گاؤں کی طرف چل رہا۔ وہ تالاب دیکھنے کے لئے جس میں دروپدی نہایا کرتی تھی۔ اپنے جلاوطنی کے آخری سال کے دوران پانڈوؤں کو اپنا نام بدل کر رہنا تھا کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ آخری سال پانڈو بھائیوں نے پنجور میں گزارا تھا۔ اور دروپدی ہر روز نہانے کی جگہ بدلتی رہتی تھی اور بھیم ہر روز اس کے لئے دھرتی کی کوکھ سے نیا چشمہ نکالتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کئی چھوٹے چھوٹے تالاب تھے۔ اب تو وہاں ایک ہی چشمہ ہے جس سے پانی نکل کر آتا ہے اور ایک تالاب میں جمع ہو جاتا ہے۔ سڑک کے کنارے اس تالاب کا پانی اب شاید ڈھور ڈنگروں کے ہی کام آتا ہے اور کسی کے نہیں۔ گاؤں میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اس کے قریب ہی ایک مسجد ہے اور پاس ہی ایک گوردوارہ۔ ایکتا کا اتنا بڑا نمونہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہونا کتنے بڑے فخر کی بات ہے۔ تین مختلف مذہبوں کا کلچر ایک دوسرے کے سامنے پہلو بہ پہلو کھڑا مسکرا رہا ہے۔ بھائی چارے کا یہ جذبہ کتنا مہان ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کی بنیادی قدروں کا ترجمان ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے کی یہ بھاونا زندگی میں نکھار لاتی ہے۔ اُسے سنوارتی ہے۔ اُسے خوبصورتی اور توانائی بخشتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر انسان ہے۔ یہ مذہب کی دیواریں تو محض نام کی ہیں۔ ان دیواروں پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو ایک ہی افق نظر آتا ہے۔ جس میں پورنیما کا چاند چمکتا ہے

اور پربھات کا اُجالا کسمساتا ہے اور سورج کی پہلی کرنیں سوتا بکھیرتے ہوئے زندگی کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ سب کی نظریں ایک ہی صبح کی منتظر ہیں۔ ایک حسین صبح کی۔ جب زندگی میں امن ہوگا، خوشی ہوگی، سکھ ہوگا اور انسان کھلے گلے سے قہقہے لگائے گا۔ فتح کے قہقہے، جیت کے منگل گان۔

اور جب میں واپس باغ کی طرف لوٹا تو پہاڑیوں کے اوٹ سے پورنیما کا چاند نکل کر فضا کو نکھار رہا تھا۔ رمیش اور کیپٹن مجھے ڈھونڈتے ہوئے سڑک پر آگئے تھے۔

"یار تم کہاں چلے جاتے ہو؟" رمیش بگڑ رہا تھا۔

"ذرا گاؤں کی طرف چلا گیا تھا"

"باغ میں ہمارے سوائے ایک بھی آدمی نہیں رہا۔ اب تمہیں ڈھونڈیں یا رات گزارنے کا انتظام کریں۔"

"راتیں گزارنے سے نہیں گزرتی ہیں بھیا، یونہی گزر جاتی ہیں اور نہ گزریں تو چٹان کی طرح ایک ہی جگہ پر رُک جاتی ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہوتیں کم بخت۔"

"میں دفتری قسم کا آدمی ہوں۔ تمہاری باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ یہ فلاسفی تم شیتل کو ہی بتانا وہی سمجھے گی۔ چلو اب۔ کیسے احمق آدمی سے پالا پڑا ہے۔"

سب عقلمند آدمی مجھے احمق سمجھتے ہیں۔ لیکن جب میں کوئی بات کرتا ہوں تو یوں میری طرف دیکھتے ہیں جیسے وہ خود احمق ہوں۔ میں نے کیپٹن کو سگریٹ آفر کیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ہم باغ کے ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

"ہائے کتنی خوبصورت رات ہے۔ . . . آؤ خودکشی کرلیں" میں نے کہا۔

"تمہیں کرو۔ تمہارا تو رونے والا بھی کوئی نہیں۔" ان کی یہ بات تیر بن کر میرے دل میں چبھ گئی۔ تمہارے نہ ہونے سے دیکھا کیا ہوگیا ہے؟ لوگ سمجھتے ہیں میری موت پر کوئی رونے والا بھی نہیں۔ تم ساتھ ہوتیں تو کسی کی جرأت تھی کوئی ایسی بات منہ سے نکالتا۔ یہ ٹھیک ہے تم مجھ سے بہت دور ہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت، جس کے خاکے ہم دونوں نے مل کر بنائے تھے۔ تمہارا خاوند ہے جس کی معقول آمدنی ہے۔ جو معقول اور مناسب باتیں کرتا ہے، میری طرح انٹ شنٹ نہیں بکتا رہتا۔ اس کا اپنا ایک دائرہ ہے جس میں میرے احباب کی نسبت کہیں زیادہ بااثر لوگ ہیں کہیں زیادہ مہذب اور متوازن۔ تم خود کام کرتی ہو۔ میری طرح تمہاری جیبیں خالی نہیں رہتیں۔ تمہارا ایک بچہ ہے۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں۔ لیکن وہ یقیناً خوبصورت ہوگا۔ تم اپنے ماحول سے مطمئن ہو، سکھی ہو۔ تمہارے ماضی کی پرچھائیں تمہارے ماحول کی چکا چوند سے ڈر کر بھاگ گئی ہے۔ لمحات کی کرچیاں تمہیں اذیت نہیں پہنچاتیں۔ کیونکہ وہ تو سب میں نے پیوست کر لی ہیں، اپنی روح میں۔ تمہیں کوئی دکھ نہیں، کوئی اُلجھن نہیں، کوئی درد نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں جب میری موت کی خبر تم تک پہنچے گی تو تمہاری روح کے سلے ہوئے زخموں کے ٹانکے ایکدم ٹوٹ جائیں گے۔ ان سے تمہارے دل کا خون بہہ نکلے گا۔ تمہاری آنکھوں سے ایک مدت کے رُکے ہوئے آنسو بند توڑ کر طوفان برپا کردیں گے اور اس طوفان میں تمہارے گھر کی دیواریں ڈوبنے لگیں گی۔ تمہارا ماحول کانپنے

لگے گا۔ تمہارا بچہ حیران نظروں سے تمہاری طرف دیکھے گا اور تم اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لوگی اور تمہارا خاوند تمہیں اپنی آغوش میں لے کر تم سے رونے کا کارن پوچھے گا اور تم کچھ بھی بتا نہ سکوگی اور روئے جاؤ گی۔ جب تک کہ تمہاری آنکھوں کے آنسو ختم نہ ہو جائیں گے۔ میں یہ باتیں سوچ رہا تھا۔ اور نکھری ہوئی چاندنی میں خاموش راستے پر گزرتے ہوئے ہمارے قدموں کی چاپ یوں گونج رہی تھی جیسے ماضی کی گزرگاہوں سے گزرے ہوئے قافلوں کی صدائیں گونجتی ہیں۔ بے قرار، مضطرب، پریشان اور منتشر — باغ کے درمیانی حصے میں یہ ریسٹ ہاؤس بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں باہر ہی رک گیا۔ ایک بار چاروں طرف دیکھا کتنی خاموشی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں جیسے اس خاموشی کے مینارے تھے۔ جو چاند کی طرف بانہیں پھیلائے اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ اتنی گہری خاموشی زندگی میں مجھے بہت مدت کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ ورنہ اس ماحول میں جس میں میری زندگی گزر رہی ہے۔ ہر گھڑی ہنگامے میں، حادثے میں، تگ و دو ہے، پل بھر کا آرام نہیں لمحہ بھر کا سکون نہیں گھڑی بھر کا سکوت نہیں۔ ایک مسلسل شور ہے۔ جیسے زندگی نوحہ کناں ہو اپنی بے بسی اور بے چارگی پر۔

شیتل بھابی اور کیپٹن کی بیوی دن بھر کے ہنگامے سے تھک کر لیٹ گئیں۔ نوکر کھانا تیار کر رہا تھا۔ رمیش بھی آرام کرسی میں دھنس کر اپنی تھکن اتار رہا تھا۔ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونکا اور گھوم کر دیکھا۔

"کون "

"کیپٹن"

"کیا بات ہے کپتان؟" وہ اتنی دیر میں دو ایک پیگ جلدی سے چڑھا کر باہر آ رہا تھا۔

"پیو گے؟"

"نہیں میں شراب نہیں پیتا۔"

"تو کیا پیتے ہو؟"

"میں زہر پیتا ہوں کپتان، جو تم نہیں پی سکتے۔"

"تم واقعی احمق ہو۔ رمیش ٹھیک کہتا ہے۔

میں نے اسے سگریٹ پیش کیا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی تمہیں شراب پینے سے نہیں روکتی؟"

"وہ تو مجھے جینے سے بھی روکتی ہے۔ لیکن میں پھر بھی زندہ ہوں۔"

یہ فوج کا کپتان ہے۔ اس نے جنگ میں دشمن کی فوجوں کو جیتا ہے۔ لیکن خود زندگی سے ہار رہا ہے۔ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے وہ پھر اندر چلا گیا ہے۔ ایک آدھ پیگ اور چڑھائے گا، زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے۔ ادھر میں ہوں کہ نہتا ہی اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ اس نے لاکھ بار سمجھوتہ کرنے کے لئے کہا اور میں نے ہر بار ٹھکرا دیا۔ پھولوں کی کیاریوں سے چاندنی میں گھل کر ہلکی سی خوشبو آ رہی ہے جیسے

تم کہیں میرے قریب کھڑی ہو اور بالوں میں کنگھی کر رہی ہو ۔ اور تمہارے گیسوؤں میں سے نکلتی ہوئی مست سی خوشبو میرے دماغ کا احاطہ کیے جا رہی ہے ۔ یہ خوشبو جانے کب تک میرا تعاقب کرتی رہے گی ۔ تم اپنے بالوں میں کنگھی کرنا چھوڑ دو کہ ان میں سے نکلتی ہوئی خوشبوئیں بکھر کر میرے ماضی کو ہٹو کے نہ دیتی رہے ۔

کپتان پھر آ گیا ہے ۔ اس نے میرے کندھوں کو تھپتھپایا ہے ۔ گلاس اس کے ہاتھ میں ہے اور اس میں ہلکورے لیتی ہوئی شراب چاندنی میں کتنی حسین لگ رہی ہے ۔ جیسے ریشمی گھونگھٹ میں کسی دوشیزہ کے گال چمک رہے ہوں ۔ اور وہ گلاس کی بیرونی سطح پر اس طرح انگلیاں پھیر رہا ہے جیسے کسی عورت کے گالوں کو سہلا رہا ہو ۔ دھیرے دھیرے ملائمت سے ۔ اور پھر وہ ساری شراب ایکدم پی گیا ۔ اور خالی گلاس اس نے نیچے پھینک دیا ۔ ایک چھن کی آواز آئی ۔ نیچے تالاب میں جہاں فوارے چھوٹا کرتے ہیں گلاس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھر گئے اور چاندنی میں یوں چمکنے لگے جیسے پانی کی سطح میں سیپیاں چمکتی ہیں ۔

"تم نہیں پیو گے ؟"

"نہیں ۔"

"تو جاؤ جہنم میں ۔" کپتان خفا ہو کر ریسٹ ہاؤس کے اندر چلا گیا ہے ۔ یہ لوگ کیوں مجھے بددعائیں دیتے رہتے ہیں ۔ اس لئے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں میں ایسا نہیں کرتا ۔ اس لئے کہ میں اپنی انفرادیت کو لوٹنے نہیں دیتا ۔ اس لئے کہ میں جھکنا نہیں ۔ اپنی ضد پر اڑا رہتا ہوں ۔ تم نے بھی تو اسی لئے مجھے چھوڑ دیا تھا کہ میں جھکنا نہیں چاہتا تھا ۔ اپنی ضد پر اڑا رہنا چاہتا تھا ۔ جبکہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا ۔ میں جب نہیں جھکا تو اب کیا جھکوں گا ۔

نوکر نے کھانا بنایا ہے لیکن کسی کے بھی کھانے کا موڈ نہیں ۔ جانے کیا ہو گیا ہے سب کو ۔ میں بڑا خود غرض ہوں کہ اپنی خوشی کے لئے دوسروں کی خوشیاں برباد کرتا ہوں ۔ لیکن میری خوشی ہے ہی کہاں ۔ یوں کہو کہ اپنے غلط رویے سے دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہوں ۔ کس چاؤ سے رمیش نے یہ ریسٹ ہاؤس ریزرو کرایا تھا کہ یہاں رات کو چاندرات کا لطف اٹھائیں گے ۔ رات بھر تاش کھیلیں گے ۔ گپیں لڑائیں گے اور ہنگامہ کریں گے ۔ لیکن میں نے ان کا سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے ۔ اب میں اپنے اس درد کا کیا کروں ؟ جب کوئی خوشی اور سکون کا لمحہ نزدیک آنے لگتا ہے میرے سینے میں درد کی لہریں اس شدت سے اٹھتی ہیں کہ میری نظریں کہیں اٹھتی ہی نہیں صرف اپنے سینے پر جمی رہتی ہیں ۔ ایسے سینکڑوں لمحے میں نے ضائع کئے ہیں ۔ میرے عزیز دوستو! مجھے معاف کر دو ۔ تم میری دنیا کے نہیں ہو ۔ میری دنیا کا یہاں کوئی بھی نہیں ۔ میں بالکل اکیلا ہوں ۔ اجنبی ہوں غریب الدیار ہوں ۔ میں یسوع مسیح ہوں جسے صلیب پر لٹکایا گیا ہے ۔ میں ہی بدھ ہوں جس نے تیاگ کیا ہے ۔ میں ہی کرشن ہوں جس نے مہابھارت کی جنگ میں سارتھی کے فرائض انجام دیئے ہیں ۔ میں ہی رام ہوں جس نے بارہ برس کا بن باس کاٹا ہے ۔ میری ہستی بالکل الگ ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ اس لئے تم اپنی دنیا کی خوشیوں کو میری خاطر نہ چھوڑو ۔ میں ایک بار پھر مروں گا کہ زندگی کو نکھرنے کے لئے ابھی میرے خون کی ضرورت ہے ۔ تم سب مل کر مجھے پھانسی پر لٹکا دو ۔ اس میں تمہاری نجات ہے ۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور

لوکراونگھ رہا ہے۔

سب مجھ سے ناراض ہوکر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے ہیں شتیل بھابی بھی مجھے بلانے نہیں آئی۔ وہ بھی
ناراض ہے۔ لیکن یہ چاندنی رات ناراض نہیں۔ وہ مجھے کس محبت سے باہر بلا رہی ہے۔ آسمان کے کھلے پھیلاؤ میں
اُدھر کسولی میں جلتی ہوئی بتیاں اس طرح نظر آرہی ہیں جیسے آتشدان میں کوئلے دہک رہے ہوں سورج پور کی فیکٹری
کی چمنیاں شاید اب بھی دھواں اگل رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے پہاڑیوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، جنہیں
چاندنی چوس رہی ہے۔ پورا چاند تنہا چمک رہا ہے۔ ستاروں کے درمیان اور مجھے شیلے کی وہ سطریں یاد آرہی ہیں۔
جو اس نے چاند کے لئے لکھی تھیں

اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں خود اس چاند کی طرح اپنی زندگی کے آکاش میں تنہا چکر لگائے جارہا ہوں،
بے مقصد اور بے منزل۔ جانے کہاں پہنچوں گا میں۔ شاید کہیں بھی نہیں۔

میں اس بالکونی میں اکیلا کھڑا ہوں اور میرے سامنے سارا باغ پھیلا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میں
اس بالکونی سے اپنی زندگی کی بھرپور تصویر دیکھ رہا ہوں جو چاندنی میں چمک رہی ہے۔ اب تصویر کا رنگ پھیکا
پڑ گیا ہے۔ اس کے نقش دھندلے ہو گئے ہیں۔ لکیریں اتنی واضح نہیں رہیں۔ جیسے گرد کی تہیں جم گئی ہیں اس پر
میں نے جیب سے اپنا پرس نکالا ہے۔ اسے کھول کر تمہاری تصویر کو دیکھ رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے تم میرے سامنے
کھڑی ہو۔ مجھ سے بات کر رہی ہو۔ میں تمہاری آواز کو سن رہا ہوں۔ تمہارے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ تم مسکرا رہی ہو۔
تمہارے خوبصورت دانت کتنی خوبصورتی سے چمک رہے ہیں۔ تمہارے گالوں کا رنگ کیسا نکھر آیا ہے۔ تمہارے
بالوں کی لٹ تمہارے ماتھے کو کتنے پیار سے چوم رہی ہے۔ یہ کس کی آواز آرہی ہے میرے کانوں میں؟ تم گا رہی ہو؟
کون سا گیت گا رہی ہو تم؟ امر گیت۔ گاؤ۔ میری زندگی کی امانت دار گاؤ۔ تم گاتی جاؤ۔ خدا کرے تمہارے ہونٹوں
پر سدا راگنیاں ہی رقص کریں اور جب تمہیں یہ احساس ہو کہ تمہارے گیت ختم ہونے کو ہیں تو مجھے کہنا، میں اور
گیت دوں گا تمہیں۔ انگنت گیت تمہارے ہی لئے لکھ رہا ہوں یہ تمام گیت۔ تمہیں ہی بھینٹ کرنے کے لئے۔

بالکونی میں کھڑا دیکھ رہا ہوں سامنے کی پہاڑیوں کو۔ کہیں کوئی الاؤ جل رہا ہے۔ جنگلی جانوروں کو ڈرانے
کے لئے کسی کسان نے اپنے کھیتوں کے باہر سلگا رکھا ہوگا یہ الاؤ۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس آگ کی تپش یہاں تک
پہنچ رہی ہے۔ اس کے شعلوں کی روشنی چاندنی میں گھل کر اسے بھی گرم کرتی جارہی ہے۔ اس گرمی میں بے شمار
پھولوں سے نکلتی ہوئی خوشبو پھیل رہی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے سب؟ ہوا کے تیز جھونکے چلنے لگے ہیں جیسے چاندنی
کو بھڑکانا چاہتے ہوں۔ ہوا کے تو جھونکو! مجھ پر رحم کرو۔ میں غریب الوطن ہوں۔ میری منزل مجھے چھوڑ گئی ہے۔
میں راستوں میں بھٹک گیا ہوں، مجھے اور نہ بھٹکاؤ۔ مجھے یہیں کھڑا رہنے دو۔ میں اندر جانا نہیں چاہتا۔ کمرے
کے اندر بڑی گھٹن ہے۔ زندگی میں حبس اور گھٹن کو میں نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ یہ جھونکے رک جائیں تو
میں صبح تک یہیں کھڑا اس چاندنی کو دیکھتا رہوں۔ آسمان میں چمکتے ہوئے تاروں کے نیچے اور محسوس کرتا رہوں گا۔

کہ شبنم کا امرت آہستہ آہستہ گر رہا ہے اور اس رات کو امر کر رہا ہے۔ جس کے فرش پر یادوں کی کرچیاں ہر سُو بکھری پڑی ہیں۔

میں خاموشی سے اتھاہ سمندر میں ایک جزیرے کی آخری حد پر کھڑا ہوں اور لمحات کا الاؤ جل رہا ہے اور اس میں یادوں کے پھول زندگی کی ٹہنیوں سے گر کر جھلس رہے ہیں اور میں دیکھے جا رہا ہوں۔ خاموش اور اداس۔ ..

موڑ

رتن کور سے پہلی ملاقات محض ایک اتفاق تھا۔

ایک بہت بڑی کلچرل کانفرنس ہو رہی تھی چنڈی گڑھ میں۔ جس ادارے نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، دراصل تو وہ ایک ون مین ادارہ ہی تھا، جس کا پریذیڈنٹ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر تھا اور سکریٹری اس کی بیوی تھی، جس کے بڑے چرچے تھے۔ لیکن ادارے کی ایک ایڈوائزری کمیٹی بھی تھی جس میں کچھ اونچے لوگ شامل تھے۔ رتن کور اس کمیٹی کی ممبر تھی۔ ایڈوائزری کمیٹی نے مدد کیلئے ایک استقبالیہ کمیٹی بھی تشکیل کر لی تھی اور مجھے اس کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا۔ اسی کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی جو اس کلچرل ادارے کے پریذیڈنٹ نے اپنے آفس میں رکھی تھی۔ میں پہلی بار وہاں گیا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ میٹنگ میں میری ساتھ والی کرسی پر رتن کور بیٹھی تھی۔ جب سیلف انٹروڈکشن ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ والی کرسی پر نہایت ہی خوبصورت کپڑے کی بہت اچھی سلی ہوئی ڈبلیو رنگ کے شلوار قمیص پہنے، جو خاتون بیٹھی تھی اس کا نام رتن کور تھا۔ اور وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کلچرل ادارے کی لائف ممبر بھی تھی اور اسے کلچرل ایکٹی وِیٹیز میں خاصی دلچسپی تھی۔ رتن کور کے بعد جب میں نے اپنی انٹروڈکشن کرائی تو اس نے مسکرا کر دھیرے سے کہا۔

"تو آپ ہیں ماتھر صاحب؟"

"جی"۔ اس کی عمر کے لحاظ سے اس کا چہرہ بہت زیادہ شگفتہ تھا، حالانکہ اس نے میک اپ بھی نہیں کر رکھا تھا۔

"میری ایک دوست آپ کی بہت تعریف کرتی ہے"۔

"کون؟" میں نے اس کے گورے چہرے، خوبصورت آنکھوں اور موتیوں جیسے آب دار دانتوں کو نہارتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی ایک فین ہے۔ آپ کی آواز پر مرتی ہے"۔

"مگر وہ ہے کون؟" میں نے مسکرا کر اس کی تمام شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔
"پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے بڑے ہی پیارے انداز سے مسکرا کر موضوع بدل ڈالا۔
اور پھر کمیٹی کی میٹنگ کی کاروائی شروع ہو گئی اور پریذیڈنٹ نے دو تین چھوٹی کمیٹیاں نامزد کر دیں تاکہ کانفرنس کا کام بانٹا جا سکے اور کہیں کنفیوژن نہ ہو۔ مجھے لگا کہ ادارے کا پریذیڈنٹ ایک اچھا آرگنائیزر تھا اور ایک اچھا پی آر او بھی تھا۔ اس نے بڑی مسکین آواز اور عاجزانہ لہجے سے اپنے سارے ہی کام دوسروں کے ذمے ڈال دیا۔ روپیہ بھی کم خرچ ہو اور بادرشن بھی زیادہ نہ ہو۔ ایڈوائزری کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی کے قریب قریب ہر ممبر نے ایک یا دو مہمانوں کو اپنے پاس ٹھہرانے کا وعدہ کر لیا۔ رتن کور نے پانچ سیکٹر کی اپنی چار کنال کی کوٹھی کا اوپر والا حصہ کلچرل ادارے کے مہمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے بڑا ہی فراخدلی کا وعدہ کرنے کے بعد پریذیڈنٹ نے مجھ سے پوچھا
"ماتھر صاحب، آپ کے ذمے پاکستان سے آنے والے دو مہمان کر دوں؟"
"نہیں، آئی ایم سوری۔"
"کیوں؟"
"میرے پاس زیادہ اکاموڈیشن بھی نہیں اور زیادہ سہولت بھی نہیں۔" پریذیڈنٹ نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک دوسرے ممبر کو مخاطب کیا لیکن رتن کور چپ نہ رہ سکی اور دھیرے سے بولی اپنے چہرے کو میرے کان کے قریب کر کے۔
"سہولت کیوں نہیں آپ کے پاس؟"
"میرے ساتھ میری بزرگ ماں رہتی ہیں اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو ڈسٹرب ہر۔"
"اور کون ہے آپ کے ساتھ؟"
"مائی اون سیلف - اے وی آئی پی۔"
"آئی سی۔" اس نے بڑے ہی پیارے انداز سے مسکرا کر کہا۔
اس کے بعد میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔
میٹنگ ختم ہوئی تو میں اپنا سکوٹر اسٹارٹ کر کے چلا آیا اور لوگ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہے۔
شام کو میرے گھر کے سامنے ایک فیئٹ کار رکی
اس میں سے رتن کور اتری۔ اس نے کار کی کھڑکی کا شیشہ بند کیا۔ میرے گھر کا گیٹ کھولا اور پھر اندر آ کر کال بیل بجائی۔
میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ ایک اورشیڈ کی پیاری سی شلوار قمیض پہن رکھی تھی

اس نے۔ اس کا چہرہ اور بھی شگفتہ لگ رہا تھا۔

"تشریف لائیے"

وہ اندر آ گئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں؟"

"صبح دی ہوئی میری سٹیٹمینٹ کو ویری فائی کرنے"

وہ بہت زور سے ہنسی۔ پھر ایکدم رُک کر بولی۔

"ماں جی اتنی زور کی ہنسی سے ڈسٹرب تو نہیں ہوں گی"

"وہ ہنسی سے ڈسٹرب نہیں ہوتیں"

"صرف آپ کے ریاض سے ڈسٹرب ہوتی ہیں"

"ہاں۔ وہ بھی اس وقت جب میں غزلیں گاؤں۔ بھجن گانے سے ڈسٹرب نہیں ہوتیں"

"لیکن آپ غزلیں بہت پیارے انداز سے گاتے ہیں"

"میری آواز کی فین کون ہیں۔ جن کا آپ ذکر کر رہی تھیں؟"

"مجھے معلوم تھا۔ آپ یہ سوال ضرور پوچھیں گے؟"

"اچھا نہیں لگتا تو مت بتائیے"

"ریڈیو پر آپ کی آواز بہت ہی خوبصورت لگتی ہے۔ آپ ٹیلی ویژن پر کیوں نہیں گاتے؟"

"ٹیلی ویژن میں آواز کے ساتھ شکل بھی سامنے ہوتی ہے"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"آواز کا امپیکٹ ختم ہو جاتا ہے"

"تو آپ ٹیلی ویژن پر کبھی نہیں گائیں گے"

"شاید نہیں"

"دُوردرشن جالندھر کے ڈائرکٹر میرے واقف ہیں"

"میرے بھی واقف ہیں وہ۔ آپ اگر کوئی پروگرام لینا چاہیں تو دلوا سکتا ہوں"

"میں اپنی شکل کا امپیکٹ خراب کرنا نہیں چاہتی" اس نے بڑے ہی خوبصورت انداز سے مسکرا کر جواب دیا۔

"اگر آواز میری ہو جائے اور چہرہ آپ کا؟"

"تو پھر لسنرز تباہ ہو جائیں گے"

"اور آپ کسی کو تباہ کرنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں ایسی بات بھی نہیں ڈی پینڈز"

"ڈی پینڈز اون وٹ؟"

"دی کنسرنڈ پارٹی۔"

پھر ہم دونوں زور سے ہنسے اور اسی لمحہ میری ماں ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔

"میٹ مائی مدر۔"

رتن کور نے صوفے سے اُٹھ کر میری ماں کے پاؤں چھوئے۔

"جیوندی رہو" ماں نے رتن کور کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے ماں کے بیٹھنے کیلئے جگہ خالی کردی اور ذرا ایک طرف ہوگیا صوفے پر۔

"کی ناؤں ایں دھیئے تیرا؟"

"جی، رتن کور" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تیرا ہنسنا بڑا سوہنا ایں"

رتن کور اور زور سے ہنسی

"تیرے ہسن دی واج سُن کے تے میں اندر آئی سی"

رتن کور اور بھی زور سے ہنسی

"توں پہلی وار آئی ایں ساڈے گھر؟"

"جی، ماں جی"

"کی ناؤں دسیا اے توں؟"

"رتن کور"

"رتن کور سوہنا ناؤں نہیں"

"تُسیں بدل دیو ماں جی"

"رتنا رکھ لے"

"بس رتنا ہوگیا آج توں"

"تم تو سب کے نام بدلتی رہتی ہو ماں۔ میرا اچھا بھلا نام ہے راکیش وہ بھی پسند نہیں میری ماں کو"

"لمبا ناؤں ایں۔ منہ تے نہیں چڑھدا" ماں نے کہا

"کی ناؤں رکھیا اے تُسیں اپنے پُت دا؟"

"راکی"

"بہت چنگا ناؤں ایں"

"رتنا وی چنگا اے ناں؟"

"بہت سوہنا اے ماں جی۔"
"کی پیوسیں گی دھیئے؟"
"اج نہیں۔ اگلی واراں سہی۔"
"چنگا۔"
تھوڑی دیر کے بعد ماں ڈرائنگ روم سے چلی گئی اور جانے سے پہلے اس نے رتن کور کو اپنے ساتھ چمٹایا اور اسے پیار کیا۔
"آپ کی صبح کی سٹیٹمنٹ ویری فائن ہو گئی۔" وہ بولی۔
"تھینکس۔"
"آپ مہمانوں کو مت لایا کریں اپنے گھر۔"
"بہت اچھا۔ لیکن اگر کوئی مہمان آپ سے آپ آجائے۔"
"تو اسے نکال دیجئے۔"
"بٹ اِٹ ڈیپینڈز۔"
"ڈیپینڈز اون وٹ؟"
"دی کنسرنڈ پارٹی۔"
پھر وہ بہت زور سے ہنسی اور پھر اس نے کہا۔
"چلئے تو میں اگلی بار پیئوں گی لیکن پانی تو بلوا دیجئے۔"
"ویری سوری رتن کور جی۔"
"رتنا از بیٹر۔"
میں نے جب پانی کا گلاس ٹرے میں رکھکر اس کے سامنے کیا تو اس نے لمحہ بھر میں خالی کر دیا۔
"آپ کو تو بہت پیاس لگ رہی تھی۔"
"اس کا خیال آپ کو ہونا چاہیئے تھے۔ نیور مائنڈ۔"
اور پھر رتن کور جانے کیلئے اٹھی۔ میں نے دروازہ کھولا، پھر گیٹ کھولا اور پھر اسے گاڑی تک چھوڑنے باہر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے کہا۔
"آئی لو یور مدر۔"
"تھینکس۔"
"میں اب تمہارے لئے رتنا ہوں، رتن کور نہیں۔ یاد رکھنا۔"
"آل رائٹ۔"

"وہ جو تمہاری آواز کی زمین تھی، وہ میں ہی ہوں۔ رتنا۔"

بیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا اس نے کار اسٹارٹ کر دی، مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور سڑک کا موڑ مڑ گئی۔

میں نے پہلی بار احساس کیا کہ مکان سڑک کے موڑ پر ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ سیدھی سڑک تو کبھی آئے گی ہی نہیں۔ زندگی صرف موڑوں میں ہی اُلجھ کر رہ جائے گی اور زندگی کا سفر موڑوں سے نہیں راستوں سے طے ہوتا ہے۔

سات سمندر پار

کئی برسوں کے بعد اُدھر جانا ہوا تھا۔
بہت لوگوں سے ملنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن دو ایک لوگ ایسے تھے جنہیں ملنا ضروری تھا۔ ان میں رچنا سندھو بھی تھی۔ سب سے پہلے اُسی کے گھر ٹیلی فون کیا۔ پُرانا ٹیلی فون نمبر میری ڈائری میں تھا۔ ہو سکتا تھا وہ بدل بھی گیا ہو۔ ٹیلی فون ایکسچینج سے معلوم کیا۔ پُرانا نمبر واقعی بدل چکا تھا۔ نئے نمبر پر ٹیلی فون کیا —— ریسیور اُٹھاتے ہی کسی نے کہا —— "ہیلو۔"

"آپ کون ہیں ؟"

"ڈاکٹر سندھو!"

جواب سُن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ ڈاکٹر سندھو کا تو انتقال ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔ یہ کیا ماجرا تھا؟

"لیکن اُن کا تو ——"

میری بات پُوری طرح سُنے بغیر ہی بولنے والے نے کہا۔

"پلیز ہولڈ آن۔"

میں کچھ لمحوں تک تذبذب کی حالت میں ٹیلی فون کا ریسیور ہولڈ کیے رہا۔

پھر کسی عورت کی آواز آئی، بڑی مدھم اور خوبصورت۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"ذاکر!"

"سمجھی نہیں میں۔"

"کشمیری لال ذاکر۔"

"کتنے برسوں بعد آپ کی آواز سُنی ہے!"

"یقین نہیں آیا؟"

"سچ مچ نہیں آیا تھا!" اور پھر وہ ہنسی۔ مجھے لگا کئی برسوں کے بعد بھی اُس ہنسی میں وہی پہلے والی تازگی اور نغمگی موجود تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"خدا کا شکر ہے۔ ؟"

وہ یہی جواب دیا کرتی تھی برسوں پہلے بھی۔ آج بھی وہی جواب تھا۔ کچھ نہیں بدلا تھا۔

لیکن یہ ڈاکٹر سندھو کون ہیں؟"

"یہ دوسرے والے سندھو ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی" وہ پھر ہنسی۔

"آپ ہی کے پاس رہتے ہیں؟"

"پہلے وہ میرے پاس رہتے تھے۔ اب میں اُن کے پاس رہتی ہوں"

"میں سمجھا نہیں مسز سندھو"

"میں نے دو سال پہلے ری میرج کر لی تھی"

بات صاف ہو گئی تھی۔ اور کچھ پوچھنے کو باقی نہیں تھا۔ رچنا سندھو نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتایا اور کہا کہ میں شام کو اُس سے ملنے ضرور آؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

شام کو ساڑھے پانچ بجے میں ایک بہت بڑے بنگلے کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ جس پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ گیٹ کے بائیں ہاتھ لیٹر باکس تھا اور اس کے ساتھ ہی کال بیل لگی تھی۔ میں نے لمحہ بھر بنگلے کا جائزہ لیا اور اُس خوبصورت لان پر بھی نگاہ ڈالی جس کے چاروں طرف کئی رنگوں کے گلاب کھل رہے تھے۔ پھر میں نے کال بیل کا سوئچ دبایا۔ بنگلے کے اندر کہیں گھنٹی بجی تھی۔ جس کی آواز گیٹ پر کھڑا آدمی بھی سن سکتا تھا۔ پھر کشادہ برآمدے میں کھلتے ہوئے دروازے سے رچنا سندھو باہر نکلی۔ پنے تُلے قدم اُٹھاتی گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ مجھے لگا کچھ عرصہ پہلے میں نے حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں رکھا عورت کا جو مجسمہ دیکھا تھا (جس کی شہروں شہروں دھوم تھی) اِس دور افتادہ شہر میں وہی مجسمہ سردیوں کی ایک شام کو زندہ ہو کر اُس بنگلے سے باہر لان کی گھاس پر، اپنے پاؤں کے نشان اُبھارتا، میری طرف آ رہا تھا۔ میں ایک ٹک اُسے گھورے جا رہا تھا۔ جب وہ مجسمہ میرے روبرو کھڑا ہو گیا تو مجھے لگا جیسے اس کے حسین شفاف جسم سے لپٹا مہین کپڑا اب قدرے موٹا ہو گیا تھا اور چہرے کے حسن کا پرتو مدھم نظر آنے لگا تھا۔

"آداب عرض" اُس نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "تشریف لائیے"

رچنا سندھو آگے آگے چل رہی تھی اور میں اس کی پیٹھ کو دیکھ رہا تھا جس سے ساڑی کا پلو سرک کر نیچے گر گیا تھا اور زمین کو چھو رہا تھا۔ زمین کو چھوتے ہوئے ساڑی کے اُس ریشمی پلو نے، ماضی کے بکھرے

ہوئے چند لمحوں کو سمیٹ کر میرے ذہن کی دہلیز پر پھیلا دیا تھا۔ میں رچنا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا لیکن میرا ذہن دہلیز پر ہی رُک گیا تھا۔ تل بھر بھی آگے نہیں سرکا تھا۔ بلکہ کئی برس پیچھے ہٹ گیا تھا۔ کوئی سات برس پیچھے!

میں اپنے آفس میں بیٹھا اسٹینو کو ایک انکوائری رپورٹ ڈکٹیٹ کرا رہا تھا۔ کسی اسکول کے پرنسپل کے خلاف یہ شکایت تھی کہ اُس نے اسکول کے فنڈز سے بیس ہزار روپے کی رقم غبن کرلی تھی۔ محکمے نے رپورٹ فوراً طلب کی تھی۔ میں رپورٹ کا آخری حصّہ ڈکٹیٹ کرا رہا تھا۔ اور میز پر کئی فائلیں اور کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ چپراسی ایک وزیٹنگ کارڈ دے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں عام طور سے، سوائے دفتر کے اُن اوقات کے جو وزیٹرز کے لیے فکس ہیں، کسی سے نہیں ملتا۔ لیکن جانے کیوں میں نے وزیٹر کو اندر بھیجنے کے لئے کہہ دیا تھا اور شاید میں ڈکٹیشن دیتے دیتے تھک گیا تھا اور شاید اسٹینو بھی تھک گئی تھی کیوں کہ وہ بار بار اپنی شارٹ ہینڈ نوٹ بک کے صفحوں کو اُلٹ رہی تھی۔

سفید بُش شرٹ اور سفید پینٹ پہنے ایک اچھی شخصیت کا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ لگتی تھی۔

"ڈاکٹر مہجر سندھو" اُس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"تشریف رکھیے ڈاکٹر صاحب۔"

"شکریہ" اس نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم یہ فائلیں وغیرہ سنبھال لو۔ گھنٹہ بھر کے بعد باقی ڈکٹیشن لے لینا" میں نے اسٹینو سے کہا اور وہ لمحہ بھر میں فائلیں اُٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آئی ایم سوری، آئی ڈسٹربڈ یو ڈاکٹر صاحب۔"

"ایک انکوائری رپورٹ میں اُلجھا ہوا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ایڈمنسٹریشن کے چرچے تو تمام ضلع میں ہیں۔"

"خاصا بدنام ہوں مجھے معلوم ہے۔"

"میں کسی کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ صرف اپنی سیٹسفیکشن کے لئے آیا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"میں آپ کا ایڈمائیرر، بلکہ فین ہوں۔"

"آپ کی مہربانی۔"

"کئی دِنوں سے کوشش کر رہا تھا آپ سے ملنے کی۔ لیکن آپ تو ہمیشہ ہی دورے پر رہتے ہیں۔ ویسے آپ کہانیاں کس وقت لکھتے ہیں؟"

"اب تو یہ عالم ہے کہ کہانی اپنے آپ کو مجھ سے لکھواتی ہے۔ میرا تعاقب کرکے اور مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ

کر۔ ایڈمنسٹریشن کے آدمی کو تخلیقی کام نہیں کرنا چاہیئے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تو اپنے کلینک میں مریضوں کو چکمہ دے کر کچھ دیر کے لئے ادھر آ گیا تھا"

"چائے نہیں پیجیئے گا؟"

"اس وقت نہیں"

"چلئے پھر کبھی سہی"

"آپ تو کئی دنوں کے بعد آئے ہیں باہر سے؟"

"جی ہاں۔ کل صبح چنڈی گڑھ جانا ہے۔ ایک میٹنگ ہے"

"آج کی شام تو آپ فارغ ہیں؟"

"اس لحاظ سے فارغ ہوں کہ میری کوئی انگیجمنٹ نہیں۔ لیکن دیر تک دفتر میں بیٹھوں گا۔ بہت سا کام پینڈنگ ہے"

"کب تک بیٹھیں گے آفس میں؟"

"سات تو بج ہی جائیں گے"

"تو میں اپنے کلینک سے سات بجے ادھر ہی آ جاؤں گا۔ میرے گھر چلیے"

"جیسے آپ کی مرضی"

"اچھا تو اجازت" ڈاکٹر سہجر سندھو کرسی سے اٹھا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اُسے باہر تک چھوڑنے کے لئے جانے لگا تو اُس نے روک دیا۔

آفس میں وہ دن واقعی بڑا مصروفیت کا تھا۔ میٹنگ کے لیے کاغذات تیار کرنے تھے۔ انکوائری رپورٹ مکمل کر کے بھجوانی تھی۔ بہت سا پینڈنگ کام ختم کرنا تھا۔ پانچ بجے ریڈ کراس کی ایک میٹنگ بھی تھی جس میں میرا جانا ضروری تھا۔

جب میں ریڈ کراس کی میٹنگ سے لوٹ کر اُس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا اور ضروری خطوں پر اپنے نوٹس لکھ رہا تھا تو ڈاکٹر سندھو کی کار باہر رکی۔ اور پل بھر میں وہ کمرے میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوا۔

"مے آئی کم ان؟"

"تشریف لائیے"

"لگتا ہے آپ دن بھر کرسی سے ہی چمٹے رہے ہیں؟"

"ایک بار کرسی چھوڑیئے تو پھر آپ کو کرسی ملے گی یا نہیں، اس کا کیا بھروسہ؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بات تو آپ نے ٹھیک ہی کہی ہے"

"میرا کام تو ابھی نہیں نپٹا۔ باقی کاغذات میں گھر بھجوا دیتا ہوں"

"اب آپ رات کو گھر میں بھی کام کریں گے؟"

"مجبوری ہے حضور"

"تو آپ کہانیاں لکھنا چھوڑ دیں"

"اب شاعری شروع کروں گا، جس میں جم کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ شعر تو چلتے پھرتے بھی کہے جا سکتے ہیں۔ کہانی کے لئے بیٹھک ضروری ہے"

"یہ تو ٹھیک ہے" ڈاکٹر سندھو ہنسا۔ وہ بڑا فریش لگ رہا تھا۔ میں نے ڈاک کا بستہ چپراسی کے حوالے کیا اور ڈاکٹر سندھو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اُس کا گھر سول لائینز کی ایک کھلی سی بائی لین میں تھا کسی کوٹھی کی ایک چھوٹی سی انیکسی تھی۔ اُس نے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روکنے سے پہلے ہارن دیا۔ میں گاڑی کا دروازہ لاک کرنے لگا تو اُس نے روک دیا۔

"اِس کی ضرورت نہیں، یہاں سبھی شریف لوگ رہتے ہیں"

"آپ کے علاوہ"

"جی ہاں" ڈاکٹر سندھو مسکرایا۔ میں نے دروازے پر لگی نیم پلیٹ پڑھی۔ ڈاکٹر جی ایس سندھو۔ ایم بی بی ایس۔

گھر کا دروازہ کھلا تو میری آنکھیں چوندھیا گئیں۔ سامنے کوئی تیس بتیس برس کی تیکھے نین نقش والی ایک گوری سی عورت کھڑی تھی۔ خوبصورت ساڑی میں ملبوس۔ ہونٹوں پر بڑی ہی پیاری اور معصوم مسکراہٹ۔ جس کا اتنا شدید اور فوری امپیکٹ کبھی محسوس نہیں کیا تھا میں نے۔ دن بھر دفتر میں جھک مارتا ہوا۔ تھکا ہارا ایک سرکاری افسر اور شام کو خوشبوؤں میں نہائی ایک خوبصورت جوان عورت۔ مجھے اپنے آپ میں بڑی شرم محسوس ہوئی۔ میں آفس چھوڑنے سے پہلے اٹیچڈ باتھ روم میں کم سے کم ہاتھ منہ تو دھو ہی سکتا تھا۔ یہ خیال مجھے بُری طرح کچوکنے لگا۔

"آداب عرض!" اُس نے دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے کہا۔ "آخر ڈاکٹر آپ کو پکڑ ہی لائے بُری طرح پیچھے پڑے ہوئے تھے آپ کے" اُس نے ہم دونوں کی طرف مُسکرا کر دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور ڈاکٹر سندھو اور میں دونوں اندر داخل ہوئے۔

"اندر بیٹھیں گے یا لان میں؟" ڈاکٹر نے پُوچھا۔

"جہاں آپ چاہیں"

"تو اندر ہی بیٹھتے ہیں"

"ہم ڈرائنگ رُوم میں آ گئے"

"تعارف کرا دوں ان سے آپ کا۔ یہ رچنا ہیں میری شریکِ حیات" ڈاکٹر سندھو نے کہا۔

میں صوفے سے ذرا سا اُٹھا اور رچنا کو سلام کیا۔ ڈاکٹر سندھو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"انہیں بھی آپ کی کہانیاں پسند ہیں"

"شکریہ"

"اپنی تحریروں میں کہیں کہیں یہ جو انگلش کے الفاظ لے آتے ہیں آپ۔ وہ بہت لطف دیتے ہیں۔"
رچنا بولی۔

"میں اُسے اپنی خامی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن ہمیں تو آپ کا یہ انداز پسند ہے۔"

"آپ کو بھی ڈاکٹر صاحب؟"

"مجھے تو وہ سب کچھ پسند ہے جو انہیں پسند ہے۔"

"بس یہی جادو ہے ڈاک کے پاس آپ خبردار رہیے ذاکر صاحب"۔ رچنا سندھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
مجھے لگا کہ رچنا سندھو کی اس خوبصورت اُجلی اور خوشگوار ہنسی کی پھوار نے تمام دن کی میری تھکن اُتار دی
تھی اور میں دھیرے دھیرے دفتری فضا کے بوجھ سے باہر نکل آیا تھا۔

"کیا لیجئے گا آپ؟"

"چائے۔"

"اور کچھ نہیں؟"

"اس وقت نہیں۔"

"تو کب؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کسی اگلی ملاقات میں۔"

رچنا سندھو نے بہت ہی بڑھیا چائے پلائی اور اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا کیک کھلایا۔ اور پھر کچھ بہت ہی
خوبصورت شعر سنائے۔

ڈاکٹر سندھو اور رچنا سندھو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

دوسری ملاقات تک جو بہت دِنوں کے بعد ہوئی، مجھے ان دونوں کے بارے میں بڑی عجیب وغریب
قسم کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ڈاکٹر سندھو پنجابی جاٹ تھا۔ آرمی سے ریٹائر ہونے کے بعد اُس نے لکھنؤ میں پریکٹس
شروع کردی تھی۔ رچنا علاج کے لیے اُس کے پاس آنے لگی تھی۔ عمر کے فرق کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کو
قبول کرلیا۔ ڈاکٹر سندھو نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا جس سے اُس کا ایک جوان لڑکا بھی تھا اور رچنا کو ساتھ لے
کر اس شہر میں چلا آیا، جہاں اُسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اِس اجنبی شہر نے بھی بہت دِنوں تک انہیں نہیں اپنایا تھا۔
اس لیے وہ سماجی طور پر بہت حد تک کٹے ہوئے تھے۔ اُس کی پہلی بیوی اور لڑکا لدھیانہ چلے گئے تھے جہاں اُن کی
زمینیں تھیں۔

دوسری ملاقات کے بعد یہ لوگ میرے بہت اچھے دوست بن گئے۔

اس دوران میرا ٹرانسفر پھر چنڈی گڑھ ہو گیا۔ یہ شہر باوجود اُس کی بہت سی خامیوں کے مجھے پسند ہے۔ کبھی کبھی

ڈاکٹر سندھو اور رچنا ایک آدھ دن کے لئے چنڈی گڑھ آجاتے۔ ڈاکٹر سندھو بہت اچھی کہانیاں لکھتا تھا۔ جب وہ تین چار کہانیاں لکھ لیتا تو فوراً چنڈی گڑھ بھاگتا۔ مجھے سُنا لینے کے بعد اُسے بڑی تسکین ملتی۔ میں نے اُسے کئی بار کہا کہ وہ اپنی کہانیاں چھپنے کے لیے بھیجے لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتا اور کہتا۔

"میں کہانیاں صرف رچنا کے لیے لکھتا ہوں، اور کسی کے لیے نہیں۔"

"اور سُناتے صرف آپ کو ہیں۔" رچنا چھیڑتی۔

"رچنا کو سُنانے کے بعد ہی آپ کو سُناتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔"

"تو یوں کیجئے۔ آپ کہانیوں کا مجموعہ چھپوائیے۔ اور اسے ڈیڈیکیٹ کیجئے رچنا جی کے نام۔"

"آپ کی یہ تجویز ٹھیک ہے۔ میں اپنی تمام کہانیاں آپ کو بھیج دوں گا۔ دس اچھی کہانیاں چُن لیجئے اور ایک مختصر سا پیش لفظ بھی لکھ ڈالیے۔"

"مختصر پیش لفظ کیوں ڈاک؟"

"یہ بہت مصروف آدمی ہیں۔ طویل پیش لفظ نہیں لکھ پائیں گے۔"

"اگر لکھ دُوں تو؟" میں نے پوچھا۔

"تو مجموعے کا انتساب بھی اِنہی کے نام کر دیجئے۔" رچنا بولی۔

"تو میں مختصر پیش لفظ ہی لکھوں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن ہوا یہ کہ ڈاکٹر سندھو نے اپنی کہانیاں مجھے نہیں بھیجیں اور مجھے یہ موقع ہی نہ ملا کہ میں اُس کی کہانیوں کا طویل یا مختصر پیش لفظ لکھ سکتا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد ایک دن اچانک اطلاع ملی کہ ڈاکٹر سندھو کا ہارٹ فیلیور سے انتقال ہو گیا تھا۔ اور اب اس بات کو سات سال ہو گئے تھے۔

میرے ذہن کی دہلیز پر رچنا کی ساڑھی کے ریشمی پلو نے جو لمحے بکھرا دیئے تھے اب وہ سمٹ کر ایک نقطے پر آگئے تھے۔ رچنا کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کچھ دیر پہلے میرا ذہن جو میرا ساتھ چھوڑ کر دہلیز پر ہی رُک گیا تھا اب کہیں جا کر آگے بڑھ سکا تھا۔

رچنا نے برآمدے میں پہونچ کر ڈرائینگ رُوم کا دروازہ کھولا اور پھر ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر چلنے کو کہا۔ اب رچنا اور میں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"آپ کا یہ گھر تو بہت خوبصورت ہے۔"

"تین سال پہلے ہی بنوایا تھا۔ لُدھیانہ والی زمین بیچ دی تھی۔"

"سکیشن کے لئے بھی تو خاصا جھگڑا ہوا ہوگا؟"

"جی ہاں، ڈاک کی پہلی بیوی اور لڑکے نے خاصا طوفانِ بدتمیزی برپا کیا۔ اگر ڈاک کے بھائی صاحب مدد نہ کرتے تو میں یقیناً ہار جاتی۔"

رچنا کی بات سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سندھو کا بھائی اس اسٹیج پر رچنا کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی موت کے لگ بھگ تین سال بعد۔

"تو انہوں نے آپ کی بہت مدد کی؟"

"جی۔ اس بات پر اُن کا اپنے بیوی بچوں سے بھی جھگڑا ہو گیا۔ آخر وہ سب کو چھوڑ کر یہیں آ گئے اور ڈاک کا کلینک بھی سنبھال لیا۔"

"گفتگو کے دوران یہ دوسرا انکشاف ہوا تھا۔"

"پھر؟"

"اُنہوں نے ہی لُدھیانہ والی زمین بیچی اور یہ خوبصورت بنگلہ بنوایا۔ زمین تو ڈاک ہی خرید گئے تھے۔"

"کلینک کو سنبھال لینا تو ٹھیک قدم تھا۔"

"جی ہاں۔ آہستہ آہستہ اُن کی پریکٹس جم گئی۔ لیکن لوگوں نے میرے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ بخشا تو خیر انہوں نے مجھے پہلے ہی نہیں تھا۔ اب تو اُن کی مخالفت اور بھی بڑھ گئی۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"انجام یہ ہوا کہ مجھے ڈاک کے بھائی صاحب سے شادی کرنا پڑی۔"

اس بیچ میں رچنا اُٹھ کر چلی گئی۔ چائے کے انتظام کے لیے بھی اور اپنے آپ کو اگلی گفتگو کے واسطے تیار کرنے کے لئے بھی۔

اُس کے آنے تک میں ڈرائینگ رُوم کا جائزہ لیتا رہا۔ سات برس پہلے گھر کے ہر کونے میں ڈاکٹر سندھو اور رچنا سندھو کے فوٹو موجود تھے۔ اب ڈاکٹر سندھو کا ایک بھی فوٹو نہیں تھا کسی جگہ۔ اب ڈرائینگ رُوم میں اُس کے بھائی کی تصویریں تھیں۔ کچھ صرف اُس کی اور کچھ رچنا کے ساتھ۔ ڈاکٹر سندھو جو کبھی اس گھر کا مالک تھا اب کہیں بھی موجود نہ تھا۔

چائے کی پیالی لیتے ہوئے میں نے پُوچھا۔

"آپ کو یاد ہے ڈاکٹر سندھو اپنی کہانیاں مجھے بھیجنے والے تھے۔ جن کا پیش لفظ مجھے لکھنا تھا اور جن کا انتساب آپ کے نام ہونا تھا۔"

"بس اُسی کے بعد ڈاک چل بسے اور کہانیاں فائلوں میں رہ گئیں۔"

"اب مجھے دے دیجئے وہ ساری کہانیاں۔ میں پبلشر بھی خود ہی تلاش کر لوں گا۔"

"تلاش کرنا پڑیں گی، ڈاکٹر صاحب ڈاک کے سبھی کاغذات میاں نے ایک ٹرنک میں ڈال کر اسٹور میں رکھ دیئے تھے۔"

یہ ایک اور انکشاف تھا۔

ڈاکٹر کی یادیں اب ٹرنک میں ڈال کر گودام میں پھینک دی گئی تھیں۔ مجھے دھکا لگا یہ سُن کر۔

"ڈاکٹر سندھو کے بھائی صاحب کہاں ہیں؟"

"کلینک میں۔ آج چار بجے چلے گئے تھے۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ کچھ دیر کے لیے رُک سکتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر چلا گیا تھا۔"

بس اس کے بعد زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ گفتگو کی آخری سٹیج آ چکی تھی۔

"تو اب اجازت دیجئے۔"

"تشریف لانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔" میرا جواب سُن کر رچنا ہنسی۔ لیکن ہنسی پہلے جیسی فریش اور نغمہ ریز نہیں تھی۔

رچنا مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ لمحہ بھر رُکی۔ پھر گیٹ بند کر کے بنگلے کے اندر چلی گئی۔

میں کچھ دیر گیٹ کے باہر رُک کر اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کی ریشمی ساڑی کا پلو اب بھی زمین پر سرک رہا تھا۔ یہ اُس کا انداز تھا شاید۔ لیکن اب اُس کے پلو نے میرے ذہن میں ریت کے ذرّے نہیں بکھیرے بلکہ سات سمندروں کا پانی نچوڑ ڈالا میرے سامنے سات سمندروں کا پانی، جس میں ڈاکٹر سندھو اور اُس کی تمام یادیں ڈوب گئی تھیں اور چاروں طرف پھیلے پانی کا کہیں اور چھور نہیں تھا، کہ میں کسی جگہ سے کسی لہر کو چھو سکتا اور گذرے لمحوں کی کسی چھاپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔

"سات سمندر پانی، ڈاکٹر سندھو کی یادیں اور میں!!"

میرا درد اکیلا نہیں

اِس وقت میں سول ہاسپٹل کے پرائیویٹ وارڈ کے رُوم نمبر پانچ کے بیڈ پر پڑی ہوں۔ کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا ہے مجھے لیبر رُوم سے ٹرالی میں لٹا کر یہاں لائے ہوئے جب میں لیبر روم میں گئی تھی تو دل میں بے حد گھبراہٹ تھی، ہونٹ سُوکھ رہے تھے اور بنا کسی کارن پسینہ آئے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود میں بہت پر اُمید تھی۔ اور جب لیبر رُوم سے باہر لائی گئی تو پوری طرح شکست خوردہ اور ہاری ہوئی تھی۔ اور اب پرائیویٹ وارڈ میں بستر پر ایک ایسے سپاہی کی طرح پڑی ہوں جو محاذ پر ڈٹ کر لڑا ہے۔ اپنے انگ انگ پر زخم کھائے ہیں لیکن آخر ہار گیا ہے۔ نہ اس کا حوصلہ کام آیا ہے نہ عزم۔ ڈاکٹر نے سر کے نیچے تکیہ رکھنا منع کر رکھا ہے۔ کروٹ لینا بھی روک دیا ہے۔ صرف سیدھی پڑے رہنے کی ہدایت کی ہے۔ بے حد درد ہو رہا ہے لیکن برداشت کر رہی ہوں۔ جو درد رُوح کی گہرائیوں میں لاوے کی طرح سلگ رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے جسم کا درد مجھ سے سہا نہیں جاتا رُوح کے درد کا تجربہ نہیں۔ شاید اسی لئے اپنے ہونٹ کاٹے جا رہی ہوں اور روئے جا رہی ہوں۔

"کلپنا! رونا نہیں چاہئے تمہیں۔ بچہ تمہاری تقدیر میں نہیں تھا۔" ڈاکٹر سلاریا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ میرے آنسو پونچھ رہی ہے۔ میرے آنسوؤں سے اس کا ہاتھ گیلا ہو گیا ہے۔

اچانک ٹیس سی اُٹھی ہے پیٹ کے اندر۔ اور میں کروٹ لینے لگی ہوں۔

"کروٹ مت لو۔ بلیڈنگ زیادہ ہونے لگے گی۔" ڈاکٹر نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا ہے اور مجھے کروٹ لینے سے روک دیا ہے۔

میں نے درد اور آنسوؤں سے بھری اپنی دھندلی آنکھیں پل بھر کو ڈاکٹر سلاریا کے چہرے پر گاڑ دی ہیں۔ اس نے دھیرے سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"وی آل ڈِڈ آور بیسٹ کلپنا۔"

"آئی نو، میری ہی تقدیر خراب تھی۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ڈاکٹر چلی گئی ہے اور اُپل صاحب اسے چھوڑنے گئے ہیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا ہے اور اسی انداز سے بند ہوا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ سر کے پاس ہی رکھے چھوٹے سے تولیے سے انہیں پونچھا ہے اور ذرا سی کروٹ بھی لے لی ہے۔ پاس رکھے تازہ پینٹ کیے سائیڈ بورڈ کے خانوں میں دواؤں کے علاوہ استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہیں۔ سب سے اوپر شیشے کے گلاس میں سرخ گلاب کے تازہ کھِلے پھول بنا کسی ترتیب کے پڑے ہیں۔ اُن کی ہلکی سی مہک کا پہلی بار احساس ہوا ہے۔ میرا نوکر تُلسا اپنے لان سے خوبصورت پھول توڑ کر گلاس میں لگا گیا ہے۔ میرا اٹیچی کیس بھی اُسی نے تیار کیا تھا گو میں اس کی رہنمائی کرتی رہی تھی۔ میری ضرورت کی سب چیزیں رکھ دی تھیں، بید کی بڑی سی ڈھکن دار ٹوکری میں اُس نے ہونے والے بچے کے چھوٹے چھوٹے فراک اُون کی پیاری سی ٹوپیاں، رنگ برنگے ننھے منّے موزے، ٹیلکم پاؤڈر، چھوٹی سی کنگھی، صابن کی چھوٹی سی ٹکیا اور سُرخ رنگ کا چھوٹا سا سوپ کیس بھی کچھ ڈال دیا تھا۔

"تُلسا! تم تو یوں تیاری کروا رہے ہو، جیسے میں سُسرال جا رہی ہوں۔" میں نے کہا تھا۔

"ہماری طرف تو بچے کا آنا بھگوان کا آنا بتایا جاتا ہے۔ بی بی جی!"

"کیا کیا کرتے ہو تم لوگ؟"

"جس دن بچے کا جنم ہوتا ہے، ہم لوگ اس دن سارے گھر کو دھو کر صاف کرتے ہیں۔ دروازوں پر درختوں کے ہرے پتے رنگ دار دھاگے میں پرو کر باندھتے ہیں۔ سارے گھر میں دھوپ کی سوکھی پتیاں جلاتے ہیں۔ ماں کو تو بڑا ستکار دیتے ہیں ہم لوگ۔ اسی کی کوکھ سے تو بھگوان جنم لیتا ہے۔"

"یہاں تو تم کچھ نہیں کر رہے تُلسا!" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ہاسپٹل جانے سے پہلے وہاں آپ کا کمرہ سجا دوں گا اور پھر واپس آ کر اپنا گھر سجا دوں گا بی بی جی۔ صاحب سے کہہ دینا ناراض نہ ہوں۔"

"وہ کیوں ناراض ہوں گے، ویسے میں کہہ دوں گی۔" میں نے مسکرا کر تُلسا کی بات کا جواب دیا تھا۔ مجھے معلوم ہے اُپل صاحب بہت سخت قسم کے آدمی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اکھڑ جاتے ہیں۔ بے چارہ تُلسا کتنی بار تو بنا بات کے جھڑکیاں سہتا ہے۔

صبح جب مجھے درد شروع ہوئے تو اُپل صاحب نے فوراً ڈاکٹر سلاریا کو ٹیلی فون کیا۔ گیرج سے کار نکالی اور مجھے پچھلی سیٹ پر لیٹ جانے کو کہا۔

میں لیٹ تو گئی پر پچھلی سیٹ پر مجھے بڑا اکیلا پن لگا۔ کبھی ایسا ہوا بھی تو نہیں کہ اُپل صاحب ڈرائیو کر رہے ہوں اور میں ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر نہ بیٹھوں۔ اس سے پہلے کہ وہ کار اسٹارٹ کرتے، میں پچھلی سیٹ سے اُٹھ کر اگلی سیٹ پر آ گئی۔

"تمہیں ڈِس کمفرٹ رہے گا یہاں۔" وہ بولے۔

"یہاں بلکہ مجھے پروٹیکشن کا احساس ہوگا۔ آپ چلیے۔" انھوں نے میری بات سُنی۔ بولے نہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اُپل صاحب اکثر بات سنتے ہی ہیں بولتے نہیں۔ اپنی طرف سے وہ بہت کم ہی کچھ کہتے ہیں۔ لفظوں کا اتنی کنجوسی سے استعمال کرنے والا اپنے خاوند کے علاوہ مجھے کوئی دوسرا شخص نہیں ملا۔ اس شخص کے ساتھ بیٹھے مجھے شادی کے پہلے پہلے دنوں کی یاد آ گئی۔

ہم ہنی مون کے لیے نینی تال گئے تھے۔ بہت اچھے ہوٹل میں ریزرویشن تھی۔ نینی تال پہنچنے تک جتنا وقت لگا تھا اس میں زیادہ سے زیادہ تیس منٹ بات ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک بار نہیں۔ ٹوٹ ٹوٹ کر۔ اور اس میں بھی زیادہ رول میرا ہی تھا۔ وہ تو سنتے رہے تھے یا ہوں ہاں کرتے رہے تھے۔ پھر میں نے بھی کھسیج میں آکر بولنا بند کر دیا تھا اس سے شاید اُس شخص کو (جو اس وقت میرے ساتھ بیٹھا ڈرائیو کر رہا تھا) راحت ہی ملی تھی پریشانی نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنی طرف سے گفتگو کا آغاز کرنے کی ایک بار بھی کوشش نہ کی تھی۔ اور پھر ایک بار جانے میری کس بات کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

,, سفر کے دوران مجھے بولنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

,, کب اچھا لگتا ہے آپ کو بولنا ؟"

میرے اس معنی خیز سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے صرف مُسکرا کر دیکھا تھا۔ ایک بار میری طرف اور پھر اپنا دھیان اسٹیرنگ وہیل پر گاڑ دیا تھا۔ میں ٹپٹا کر رہ گئی تھی۔

ہوٹل میں پہلے دو دن کیسے گذر رہے تھے، یہ سوچ کر بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ دن بھر کرسی میں بیٹھا ناول پڑھتا رہتا۔ اور سگریٹ پھونکتا رہتا اور میں بستر سے اُٹھ کر باتھ روم تک جاتی۔ ایک آدھ بار آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی۔ سوٹ کیس میں سے کپڑے نکالتی انہیں دوبارہ تہ کر کے رکھتی اور پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر جھیل کو دیکھتی رہتی۔ اور جب میں بہت دیر تک تقاضہ کرتی تو وہ بڑی بے دلی سے کپڑے بدلتا اور بنا کچھ کہے سُنے میرے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آتا۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہتا اور کبھی اِدھر اُدھر نگاہ بھی ڈال لیتا۔ رات کو وہ بستر میں پڑے پڑے پھر ناول پڑھنے لگتا اور میں کھسیج کر سو جاتی۔ وہ جانے کب ٹیبل لیمپ بجھاتا اور سوتا۔ میں جب جاگتی تو وہ ابھی تک سو رہا ہوتا۔ اگر تیسرے دن وہ سانحہ نہ ہوتا جس کے بارے میں میں اب سوچ رہی ہوں تو میرا یہ شک یقین میں بدل جاتا کہ میرا خاوند امپوٹینٹ تھا۔

ہوا یہ تھا کہ جب ہم جھیل کی ساتھ والی سڑک پر خاموشی سے چل رہے تھے تو اچانک بارش ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا وہ ابھی لپک کر سامنے والی دُکانوں کے برآمدوں میں جانے کو کہے گا۔ لیکن وہ تو بس خاموشی سے چلے جا رہا تھا اپنی دھیمی سست رفتار سے۔

,, بارش ہونے لگی ہے :" میں نے کہا۔

جواب ندارد

,, بارش تیز ہو گئی ہے، بھیگ جائیں گے "۔

پھر بھی کوئی جواب نہیں۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی اور سوائے ہم دونوں کے اب کوئی لمبی سڑک پر نہیں چل رہا تھا۔ سب لوگ دُکانوں کے برآمدوں میں چلے گئے تھے۔

,, میں بُری طرح بھیگ رہی ہوں " میں نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

,, تو کسی دُکان کے برآمدے میں چلی جاؤ " اس نے ایک بار میری طرف دیکھا اور سکون سے چلتا رہا۔

"اور آپ؟"

"میں ابھی اور ٹہلوں گا۔"

بہت عجیب لگ رہا تھا یہ سب۔ وہ بھی اچھا خاصا بھیگ چکا تھا میرا بھی بُرا حال ہو رہا تھا سڑک پر اب کوئی بھی نہیں تھا۔ اور میں بھیگتی ہوئی خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں گھٹا آگے نکل گئی۔ بارش تھم گئی اور دُکانوں کے برآمدوں میں پناہ لینے والے لوگ دوبارہ سڑک پر آگئے۔ سڑک تو دوبارہ آباد ہو گئی تھی لیکن میرا من بُری طرح اُجڑ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اگلے دن اکیلی ہی واپس چلی جاؤں گی اور اس ناقابلِ فہم بے حس اور بے مروت آدمی کے پاس پھر کبھی نہیں آؤں گی۔ میری گیلی آنکھوں کی نمی بارش سے بھیگے چہرے پر پھیل گئی جسے کسی نے نہ دیکھا صرف میں نے اس نمی کی ہلکی سی گرمی اپنے ٹھنڈے چہرے پر رینگتی ہوئی محسوس کی۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اگلے دن اسے اکیلے چھوڑ کر واپس نہ آسکی تھی۔ اس رات اس نے مجھے اتنا پیار کیا کہ میں حیران رہ گئی۔

نہ وہ ناقابلِ فہم تھا، نہ بے حس نہ بے مروت۔

وہ ایک بھرپور انسان تھا جس کے پاس سب کچھ تھا۔ صرف الفاظ نہیں تھے۔

میں نے ایک بار مسکرا کر ڈرائیو کرتے ہوئے اُپل صاحب کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیا۔ جب ہم اسپتال پہنچے تو ریسپشن پر ڈاکٹر سلاریا ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اور تُلسا پرائیویٹ وارڈ میں میرا کمرہ دیکھ کر ریسپشن پر واپس آگیا تھا۔

میں نے ایک بار مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کھِل اُٹھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ نہ اُپل صاحب نے نہ ڈاکٹر سلاریا نے۔

لیکن کسی کے نہ سوچنے سے تقدیر میں لکھا تھوڑی مٹ جاتا ہے۔

میں نے ہی تو ضد کی تھی ڈاکٹر سلاریہ سے کہ وہ مجھے لیبر رُوم کے اسی کمرے میں لے جائے جہاں سبھی عورتیں اپنے اپنے بیڈ پر پڑی تھیں۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو کلپنا؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ عورتیں جو متوسط یا نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔"

"وہی جو اس وقت تمہاری ہے۔ بچے کی پیدائش کے عمل میں خدا کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا۔ ایک وی آئی پی پہلا اور ایک مزدورن، دونوں ایک ہی جیسے پراسس سے گذرتی ہیں۔"

"تم مجھے وہیں لے چلو ڈاکٹر۔"

میری بات میں کوئی لاجک نہیں تھا۔ اُپل صاحب نے بھی ڈاکٹر سلاریا کی طرح میری بات کی تصدیق نہیں کی تھی لیکن ڈاکٹر کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا مجھ سے بحث کرنے کے لئے' وہ مجھے وہیں لے آئی جہاں سُرخ سُرخ کمبلوں میں لوہے کے بیڈز پر پڑی عورتیں لیبر پینیز سے کراہ رہی تھیں۔ اتنی ڈھیر ساری عورتوں کو اس حالت میں دیکھ کر میں ڈر گئی اور میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ جی گھبرا اُٹھا۔ ہونٹ سُوکھنے لگے۔ لیکن میں خاموش رہی۔ کسی سے کچھ نہ کہا۔ باہر ہوا بہت تیز تھی اس لیے سردی تھی۔ اندر زیادہ سردی تو خیر نہیں تھی لیکن ٹھنڈ تھی ضرور۔

میرے کیس میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

نرسوں نے میرے کپڑے بدل کر مجھے ایک سفید ایپرن پہنا دیا تھا۔ میری کلائی سے گھڑی اُتار کر اسٹاف نرس نے ایک طرف رکھ دی تھی۔ ڈاکٹر سلاریا نے میرا بلیڈ پریشر چیک کیا ٹھیک تھا۔ لیکن مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے ڈیوٹی روم میں رکھی اپنی تھرموس منگوا کر فوراً مجھے گرم چائے کے کچھ گھونٹ زبردستی پلوائے۔

"درد کم ہو گیا ہے ڈاکٹر" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے سٹیتھو سکوپ میرے پیٹ پر رکھا۔ اسٹیتھو سکوپ بہت ٹھنڈا لگا مجھے۔ اسے جلدی سے کئی کئی جگہ پر رکھنے کے بعد گھبرائی ہوئی انداز میں بولی۔

"نو مُوومینٹ اِن دی چائلڈ" اس کے اپنے چہرے پر پسینہ آ گیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ میں جیسے نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ دھیمی دھیمی آوازیں بھی سنائی دی تھیں مجھے۔

"منہ سے سانس دو"

"آکسیجن دو"

"نو مووومینٹ"

"دی چائلڈ از ڈیڈ ڈاکٹر"

"ڈونٹ بی اے فُول"

یہ سب ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں ایک ہلکے شور کی شکل میں گونج رہی تھیں۔

"مسز اُپل کو مت بتانا"

"آل رائٹ ڈاکٹر"

مجھے کیا نہیں بتانا چاہتے تھے یہ لوگ یہ نرس یہ اسٹاف نرس' یہ ڈاکٹر' ہاسپٹل کا تمام عملہ' مجھ سے کیا چھپا رہے تھے۔ ماں سے چھپا رہے تھے اس کے بچے کو جس نے اپنی دھڑکنیں اسکی دھڑکنوں میں منتقل کر کے اسے اپنے پیٹ میں پالا تھا۔

"واٹ اے ہینڈسم چائلڈ"

اسٹاف نرس کی آواز تھی۔ جانے کیسے مخاطب کر رہی تھی وہ۔ اور پھر ایک بہت ہی کرخت آواز گونجی۔
"آجاتی ہیں بچے جننے۔ کوئی بھی کپڑا نہیں ہے تیرے پاس، مر جائے گا بچہ سردی سے"
کوئی نرس چیخ رہی تھی۔
"ایسا مت کہو۔ میرے پاس کوئی کپڑا ہوتا تو ساتھ نہ لے آتی۔"
"تو ہم کیا کریں"
وہ نرس اور اونچی آواز میں چیخی تھی۔
"مت چیخو اتنی زور سے" یہ ڈاکٹر سلاریہ کی آواز تھی لیکن کافی اونچی۔
مجھے لگا جیسے میری غنودگی چھٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔
"ڈاکٹر! اپل صاحب سے کہہ کر فوکری سے اس بچے کے لیے کپڑے منگوالو۔ میں نے اپنے بچے کے لئے بہت سارے کپڑے بنا رکھے ہیں"
ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ نرس میرے زخموں میں ٹانکے لگا رہی تھی۔ بہت درد ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔
"میرا بچہ کہاں ہے"
"تھوڑی دیر رک جاؤ کلپنا"
"میل آر فی میل؟"
"اے میل چائلڈ ڈیر"
"تو پھر؟"
"پھر کچھ نہیں"
"مت چھپاؤ مجھ سے ڈاکٹر میں نے سب سن لیا ہے"
"کیا سنا ہے تم نے؟"
ڈاکٹر سلاریہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بہت درد ہو رہا تھا۔
جب میں پورے دنوں کے گورے چٹے بے حس و حرکت بچے کو دیکھ رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اسی لمحہ ایک نرس پرائیویٹ وارڈ کے روم نمبر پانچ سے وہ کپڑے لائی تھی جو اپل صاحب نے اُسے دیے تھے۔ مزدورن کے بچے کے لیے نہیں، اپنے بچے کے لئے جس کے بارے میں انھیں نرس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے ایک بھرپور نظر اُن پیارے پیارے کپڑوں پر ڈالی تھی۔ جنھیں تیار کرنے میں مجھے کئی راتوں کی نیند قربان کرنی پڑی تھی۔
نرس نے میرے بچے کو میری باہوں سے لے لیا۔
دوسری نرس یہ سب کپڑے مزدورن ماں کو دے رہی تھی جو بچے کو جنم دینے میں ان تمام مراحل سے گذری تھی جن

میں سے مجھے گذرنا پڑا تھا۔ لیکن کامیابی سے میری طرح شکست کھا کر نہیں۔

اور پھر مجھے اکیلی ہی ٹرالی میں لٹا کر اور میرے جسم کو دو سرخ کمبلوں میں لپیٹ کر ڈاکٹر سلاریہ اور دو نرسیں پرائیویٹ وارڈ کے روم نمبر پانچ میں لے آئیں اور مجھے اس بیڈ پر لٹا دیا جس کے ساتھ رکھے سائیڈ بورڈ کے سب سے اوپر والے حصہ پر شیشے کے گلاس میں کچھ ہی دیر پہلے تُلسا اپنے لان سے توڑ کر لائے گلاب کے خوبصورت پھول سجا گیا تھا۔

اور اب تُلسا دیوار کے ساتھ لگا رو رہا ہے۔

اور اُپل صاحب خاموش سے کھڑے ہیں۔ اس وقت ان کے پاس ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے وہ مجھے تسلی دے سکیں۔

سامنے الماری میں بید کی ادھ کھلی ٹوکری میں سے گلابی رنگ کا ایک چھوٹا سا موزہ بڑی معصومیت سے جھانک رہا ہے۔ اپنا پیارا سا پھندنا نیچے لٹکائے۔ شاید میرے بچے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔

میری آنکھیں پھر گیلی ہو گئیں بے حد گیلی گھٹا ٹوٹ کر برس رہی ہے۔

آج سنتوش کمار مر گیا ہے۔
بھری جوانی میں اور اچانک۔
اور کوئی بھی کچھ نہیں جانتا اُس کی جوانمرگی کے بارے میں۔
نہ اُس کی بوڑھی بیوہ ماں۔ نہ اُس کی جوان خوبصورت بیوی اور نہ ہی اُس کا معصوم بچہ، جس کے ذہن میں ابھی زندگی اور موت کا کوئی تصور ہی نہیں۔

اپنی اِس اچانک اور بے وقت موت کے بارے میں صرف سنتوش کمار خود ہی جانتا ہے۔ کسی بھی دوسرے آدمی کو اس کا علم نہیں۔

میرا نام سنتوش کمار ہے اور میں خود ہی آج مرا ہوں، ایک حادثے میں اور اپنی ارتھی بھی خود ہی اُٹھائی ہے، اپنے ہی کندھوں پر اور اُسے جلایا بھی خود ہے ـــــ بڑی بے دردی سے۔ ابھی تو میری راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔

آج شام ہی تو ہوئی ہے میری موت اور شام کی موت گھر والوں کے لئے بڑی اذیت ناک ہوتی ہے کیونکہ انھیں رات بھر لاش کے سرہانے بیٹھنا پڑتا ہے اور جاگنا پڑتا ہے اور رونا پڑتا ہے اور نیند ایک سود خور پٹھان ہے جو اگلی صبح پھانسی پر لٹکائے جانے والے قاتل سے بھی اپنا سُود وصول کرتی ہے۔ تمام رات آنکھوں میں کاٹنا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا تجربہ ہے اور میں نے وہ تجربہ بھی اکیلے ہی سہا ہے۔ کمرے میں قریب ہی سوئی اپنی بیوی ارادھنا کو بھی اس میں شریک نہیں کیا۔ اُسے بھی معلوم نہیں کہ ساری رات میں کس عذاب سے گذرا ہوں۔ وہ تو رات کے پچھلے پہر جب وہ بچے کے رونے سے اچانک جاگی تو مجھے کُھلی ویران آنکھیں چھت پر گاڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"سوئے کیوں نہیں ابھی تک آپ؟"

"نیند نہیں آرہی؟"

"کسی مقدمے کا بوجھ ہے دماغ پر۔؟"

"ہاں ایک ایسے مقدمے کا جس میں میں ہار گیا ہوں۔"

"مقدموں میں ہارنا جیتنا تو ہوتا ہی ہے۔"

"یہ مقدمہ دوسری طرح کا ہے۔"

"کس طرح کا؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔ سو جاؤ منّے کو اپنی چھاتی پر لٹا کر۔"

"آپ جاگتے رہو گے؟"

"ابھی جاگوں گا تھوڑی دیر اور۔"

"کب تک؟"

"جب تک سب ملزم پھانسی پر نہیں لٹک جاتے۔"

"تو لٹکائیے ملزموں کو پھانسی پر۔ میں تو سوتی ہوں۔"

ارادھنا نے اپنی معصوم مسکراہٹ کی روشنی سے میری ویران کھلی آنکھیں چندھیا دیں اور کروٹ لے کر سو گئی۔

اور میں اُس حادثے کی تفصیلات کو اپنے ذہن میں اُبھارنے لگا جن کی زد میں آکر اسی شام میری موت ہوئی تھی۔ ڈوبے ہوئے چاند کی مدھم روشنی صرف میرے ہی بستر پر پڑ رہی تھی ایک دائرے کی شکل میں، جیسے اُس جگہ کی نشاندہی کر رہی ہو جہاں میری چتا بنی تھی اور میرے معصوم بچے نے چتا کی لکڑیوں کو آگ لگائی تھی، شام کے ملگجے دھندلکے میں اور چتا کی آگ ابھی تک جلا ڈالنے کی حد تک گرم تھی۔ جانے میری یہ راکھ کب ٹھنڈی ہوگی۔ جانے کب!

جس حادثے میں آج میری موت ہوئی ہے اُس کی تفصیلات اسی طرح سے ہیں

شام کے کوئی پانچ بجے کے قریب میرے گھر کے سامنے سرخ رنگ کی ایک کار رکی اور اُس میں سے پانچ آدمی اُترے۔

لالہ گووردھن لال

اُن کی دھرم پتنی شریمتی کیسوری دیوی

اُن کا سب سے بڑا لڑکا رام لال

چھوٹا لڑکا پرس رام

اور لڑکی سرلا رانی

کار کے ساتھ ڈرائیور کوئی نہیں تھا۔ لالہ گووردھن لال خود ہی ڈرائیو کر کے لائے تھے۔ گھر کے باہر گیٹ کے پاس ہی میرے نام کی تختی لگی تھی۔ میرا نام پڑھ کر ہی انھوں نے کار روکی تھی۔ وہ بہت دنوں کے بعد ادھر آئے تھے۔ اس لئے میرا گھر تلاش کرنے میں ذرا دقت ہوئی تھی اُنھیں، میرے گھر کے باہر لگی تختی پر لکھا تھا۔

سنتوش کمار اگروال

بی اے ایل ایل بی - ایڈوکیٹ

لالہ گوردھن لال میرے سگے ماموں ہیں اور ان کی دھرم پتنی شریمتی کپوری دیوی میری ممانی ہیں۔ اس رشتے سے اُن کے بچے میرے کزنز ہیں۔ میرے پتا جی ملک کی تقسیم سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ اُن کی موت کے وقت میری عمر کوئی چار سال کی تھی۔ وہ ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں سمانہ میں کریانے کی دُکان کرتے تھے اور آس پاس کے گاؤں کے ضرورت مند لوگ اُن سے چھوٹی موٹی رقم اُدھار بھی لے لیتے تھے۔ جسے وہ فصل کے دِنوں میں بمعہ سُود ادا کر دیتے تھے۔ میری ماں چونکہ اَن پڑھ تھی اس لئے اُسے پتا جی کے لین دین کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ پتا جی کی اچانک موت ہو جانے سے وہ تمام رقم جو انھوں نے لوگوں کو سُود پر دے رکھی تھی ڈوب گئی۔ اُس کے ساتھ اُدھار کی جو رقمیں لوگوں کے نام تھیں وہ بھی سوائے چند ایماندار لوگوں کے واپس نہ ہوئیں۔ اس کا انجام یہ ہُوا کہ میری ماں کے پاس گزارے کے لئے سوائے ایک چھوٹے سے مکان۔ اُس کے چھوٹے سے آنگن اور اُس میں لگے پانی کے ہینڈ پمپ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ جس کی آدھی فصل مزارعے لے جاتے تھے۔ پتا جی کی موت کے بعد ماں بے چاری کو تو جینے کے لالے پڑ گئے۔ اُس نے اِن ناساز گار حالات میں بھی بڑے حوصلے سے کام لیا اور پُوری تن دہی سے میری پرورش کرنے لگی۔ ایک صرف میرے ماموں لالہ گوردھن لال ہی تھے جو ہم ماں بیٹے کی بات پُوچھتے تھے۔ اُن کا جالندھر شہر میں آڑھت کا کام تھا اور اکیلے ہونے کے باوجود اُسے وہ بڑی کامیابی سے چلا رہے تھے۔ بس اُنہی کی مدد سے ماں کے مصیبت کے دِن کٹنے لگے۔ پتا جی کے رشتے داروں میں سے تو کوئی بھی سہارا دینے کے لئے آگے نہ بڑھا تھا۔ پانچویں درجے تک تو میں گاؤں کے اسکول میں ہی پڑھا کیونکہ اُس زمانے میں وہاں صرف پرائمری اسکول ہی تھا۔ اب تو خیر ہائر سیکنڈری اسکول بن گیا ہے۔ میری ماں چاہتی تھی کہ میں آگے پڑھوں لیکن اُس کے پاس کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ چنانچہ لالہ گوردھن لال ہی مجھے اپنے ساتھ جالندھر لے گئے۔ انھوں نے مجھے دسواں درجہ پاس کرایا اور پھر وہیں بی اے کرنے کے لئے ایک پرائیویٹ کالج میں داخل کرا دیا۔ اُنہی دِنوں اُن کے چھوٹے لڑکے اور میرے ممیرے بھائی پرس رام کا جنم ہوا تھا۔ جب وہ کوئی تین مہینوں کا ہو گیا تو میں اُسے اپنی بانہوں میں لئے اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہتا۔ پرس رام روتا بہت تھا لیکن میری بانہوں میں آتے ہی فوراً چپ ہو جاتا۔ اُس سے بڑا ممیرا بھائی یوں تو عمر میں مجھ سے خاصا چھوٹا تھا لیکن ہم دونوں کا آپس میں پیار بہت تھا۔ میں تو اُسے اپنے کالج کے فنکشنز میں بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ اُسے اِن فنکشنز میں شامل ہونے میں بڑا لطف آتا تھا۔ میری ماں بیچ بیچ میں مجھے ملنے آتی رہتی تھی اور جب کبھی میرا مَن کرتا تھا، چار چھ مہینوں میں میں خود بھی اُسے ملنے گاؤں چلا جایا کرتا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے کیونکہ میں نے اپنی بیوہ ماں کے بے سہارا ہونے کے باوجود اپنی پڑھائی جاری رکھی تھی۔ بی اے کر لینے کے بعد میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اب میں اپنے ماموں لالہ گوردھن لال پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ رہتا تو خیر میں انھیں کے پاس تھا لیکن اپنا خرچ چلانے کے لئے میں نے ٹیوشن ورک لے لیا تھا۔ اس سے لالہ جی بھی خوش تھے اور میرا کام بھی تسلی بخش طریقے سے چلنے لگا تھا۔

جس دِن مجھے ایل ایل بی کی ڈگری ملی اُس دِن میرے ماموں بہت خوش تھے۔ اُس شام اِس خوشی میں اُنھوں

نے سب کو گرم گرم جلیبیاں کھلائی تھیں۔ اُنھیں دیسی گھی میں تیار کی گئیں جلیبیاں بہت پسند تھیں۔ انھوں نے میرے منہ میں جلیبی ڈالتے ہوئے کہا۔

"سنتوش آج میں بہت خوش ہوں!"

"میں بھی خوش ہوں!" میری ممانی نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"تم بھی کھاؤ جلیبیاں رُکمنی دیوی۔ جی بھر کر کھاؤ!"

میرے ماموں نے ایک جلیبی اُس کے منہ میں بھی ڈال دی اور ممانی نے جلیبی سے ٹپکتے ہوئے شیرے کو اپنے کپڑوں پر گرنے سے بڑی مشکل سے روکا تھا۔

سب بڑے زور سے ہنسے تھے۔

"مجھے نہیں کھلاؤ گے جلیبیاں بھا پا جی؟" رام لال نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں نہیں؟"

میں نے ایک ایک جلیبی رام لال اور پرس رام کے منہ میں ڈال دی تھی۔

اور پھر سب نے تالیاں بجائی تھیں اور میرے ماموں لالہ گوردھن لال نے ایک زور کا نعرہ لگایا تھا۔

"میرا وکیل بھانجہ زندہ باد!"

"زندہ باد!" ممانی سمیت سب بولے تھے۔

اور گھر کا سارا ماحول قہقہوں سے گونج اُٹھا تھا۔

یوں ابتدا ہوئی تھی میرے وکیل بننے کی۔

جب سے مجھے دیسی گھی کی جلیبیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اب بھی جب کبھی جالندھر جاتا ہوں مائی ہیراں گیٹ کے باہر حلوائی کی دکان پر جا کر جلیبیاں ضرور کھاتا ہوں۔ اگرچہ اب وہ دیسی گھی کی جگہ سستے قسم کا گھی استعمال کرتا ہے لیکن جلیبیاں گرم اور خوب کراری ہوتی ہیں۔

کچھ عرصہ تو میں جالندھر میں ہی وکالت کرتا رہا لیکن پھر گوپال سنگھ کے کہنے پر چنڈی گڑھ شفٹ کر گیا۔ گوپال سنگھ کے والد پنجاب ہائی کورٹ کے بڑے مشہور کریمنل وکیل ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بطور جونیئر شامل ہو گیا تھا۔ چار ایک سال اُن کے ساتھ کام کر کے اُنھی کی رہنمائی میں میں نے اپنی علیحدہ پریکٹس شروع کر دی۔ اب مجھے بھی اچھے کیس ملنے لگے ہیں۔ میری دلچسپی بھی کریمنل کیسز میں ہی ہے۔ ماں اب میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔ میری ترقی میں ماں کا کتنا بڑا ہاتھ ہے یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ گاؤں کی زمین اور مکان میں نے بیچ دیئے ہیں۔ میری شادی بھی چنڈی گڑھ میں ہی ہوئی ہے۔ اور میری بیوی ارادھنا کچھ عرصہ سروس بھی کرتی رہی ہے۔ شروع شروع میں کیونکہ میرا کام جما نہیں تھا۔ اس لیے اُسے سروس کرنی پڑی تھی۔ لیکن جب سے کیشو پیدا ہوا ہے اور میں نے ایک کنال کی کوٹھی کرائے پر لے لی ہے۔ ارادھنا نے سروس چھوڑ دی ہے۔ اُس کی سروس چھڑانے میں ماں کا بھی ہاتھ ہے۔

ایک دن شام کو تھکی ہاری جبارادھنا گھر لوٹی تھی تو اُس کے سر میں بہت زور کا درد تھا۔ میں بھی بس ہائی کورٹ سے لوٹا ہی تھا۔ مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے ماں نے کہا تھا۔

"سنتوش، بہو کا نوکری کرنا بہت ضروری ہے کیا؟"

"میں نے کب کہا ہے ضروری ہے"

"تو اُس کی نوکری چھڑا دو۔"

"مہینے کے آٹھ سو روپے کم ہو جائیں گے؟"

"تو تمہیں بہو سے زیادہ دھن پیارا ہے؟"

"پیارا تو ہے"

"ذرا دیکھو جا کر اُسے۔ اپنے کمرے میں نڈھال پڑی ہے"

"کیا ہوا؟"

"دن بھر کام کرتی ہے۔ پھر گھر سنبھالتی ہے۔ کیشو کی دیکھ بھال کرتی ہے نڈھال نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا؟"

"گھر تو تم سنبھالتی ہو ماں؟"

"بڑھاپے میں مجھ سے خاک سنبھلتا ہے گھر۔ وہی کرتی ہے سب کچھ"

"تو کیا کریں؟"

"گھر کے کام کاج کے لئے کوئی نوکر یا نوکرانی رکھ لو"

"اور ارادھنا کی نوکری چھڑا دو؟"

"ہاں۔"

"وہ گھر میں بیکار بیٹھے گی تو پھول کر کپّا ہو جائے گی"

"ہو جائے کپّا"

"مجھے مت کہنا کچھ"

"نہیں کہوں گی"

"بے کار گھر میں رہے گی تو تم سے جھگڑا کرے گی۔

"وہ جھگڑا نہیں کرے گی"

"اتنا وشواس ہے تمہیں ارادھنا پر؟"

"ہاں۔ آخر وہ میری بہو ہے"

"مجھ سے شکایت مت کرنا"

"نہیں کروں گی"

"تو دہی بھگت لینا"

"بھگت لوں گی بابا. جب سے وکیل بنے ہو. بہت بحث کرتے ہو۔"

"بحث کے ہی تو پیسے لیتا ہوں۔"

"بہت لالچی ہوگیا ہے تو۔"

"بہت !"

یہ کہہ کر میں نے ماں کو اپنی باہنوں میں لے کر دبوچ لیا.

"کیوں اتنی زور سے کس رہے ہو باہنوں میں، میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

"کیسے ٹوٹ سکتی ہیں۔"

میری آواز سن کر ارادھنا اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئی۔

"پیار پیار میں بوڑھی ماں کی سانس گھونٹ دو تم۔" وہ بولی.

"تمہارے تو سر میں درد ہو رہا تھا؟"

"تمہیں کیا پرواہ. تم تو اپنی وکالت کرو۔"

"سن لیا، بہو بھی یہی کہہ رہی ہے۔"

"تم دونوں نے تو میرے خلاف سازش کر رکھی ہے۔"

"ہاں کر رکھی ہے۔" ماں نے کہا، "تم آرام کرو بہو اپنے کمرے میں، میں چائے لا رہی ہوں تمہارے لئے۔"

اور میری بوڑھی ماں میری جوان بیوی کو اپنی باہنوں کا سہارا دے کر اُسے اُس کے کمرے میں لے گئی اور میں اکیلا کھڑا دونوں کی اٹوٹ آستھا کو دیکھتا رہا.

اُس سے اگلے ہی دن ماں نے ارادھنا کی نوکری چھڑوا دی. ہفتہ بھر کے بعد گھر میں ایک پوربن نے کام کرنا شروع کر دیا جس کا گھر والا آس پاس کی کوٹھیوں میں مالی گری کرتا تھا۔

اب ارادھنا گھر سنبھالتی ہے ماں پوجا پاٹھ کرتی ہے اور کیشو کی دیکھ بھال کرتی ہے. کیشو بھی تو اپنی پوپلے منہ والی دادی کے بغیر نہیں رہ سکتا. لگتا ہے دادی نے پوتے پر جادو کر رکھا ہے۔

لالہ گوردھن لال نے جو احسان مجھ پر کئے ہیں، اُن کا بدلہ تو میں ساری زندگی نہیں اتار سکتا. البتہ اُن کے یا اُن کے دوستوں اور رشتہ داروں کے جو بھی کام میں کر سکتا ہوں ضرور کرتا ہوں. اس سے ماں بھی بہت خوش ہے. یہ لالہ جی کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بھی کبھی کبھی میری رائے لے لیتے ہیں. شریمتی کپوری دیوی سے ان کا مزاج نہیں ملتا. وہ ذرا اور قسم کی خاتون ہیں. میں اپنی ممانی کی عزت تو ضرور کرتا ہوں لیکن اُن کے نظریات سے مجھے اکثر اختلاف رہتا ہے. وہ روپے پیسے کے معاملے میں خاصی پکی ہیں اور پیسے کو ہاتھ کا میل نہیں سمجھتیں. بلکہ رشتہ داروں کو پیسے کا میل سمجھتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر اپنے مزاج کا تیز صابن لگا کر پیسے سے چمٹے اس میل کو چھڑا بھی دیتی ہیں. پیسہ ہاتھ میں

رہ جاتا ہے اور رشتہ دار میل کی طرح کٹ کر پانی میں بہہ جاتا ہے۔ میری ماں کی بھی ممانی سے زیادہ نہیں پٹتی۔ لیکن ماموں اتنے اچھے ہیں کہ اُن کے سامنے تو میں بھی آنکھ نہیں اُٹھاتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کا بڑا لڑکا رام لال، چھوٹا لڑکا پرس رام اور لڑکی سرلا رانی سب کے سب اپنی ماں پر گئے ہیں۔ اس لئے دھن دولت سے سبھی کو پیار ہے۔ دو برس پہلے رام لال کی شادی بھگواڑہ میں طے ہوئی۔ کچھ خاندانوں میں لڑکے بکتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے زمین کے پلاٹ یا عمارتیں بکتی ہیں۔ بکتی نہیں نیلام ہوتی ہیں۔ جس کی بولی سب سے زیادہ ہو لڑکا اس کا ہو جاتا ہے۔ رام لال کی بولی بھی خاصی اونچی گئی۔ اُسے بیاہ میں پڑھی لکھی لڑکی کے علاوہ کوئی لاکھ بھر سے اُوپر کا مال ملا۔ اُس کی شادی میں شرکت کے لئے ماں، ارادھنا اور میں سبھی گئے تھے۔ کیشو بہت چھوٹا تھا۔ اس لئے ارادھنا نہ بھی جاتی تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا لیکن ماں کا خیال تھا کہ اُس کے بھائی کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی اس لئے سبھی کو جانا چاہیئے تھا۔ ماں کی بات ٹھیک بھی تھی۔ ارادھنا اور میں اور کیشو تو شادی کے اگلے ہی دن واپس آ گئے لیکن ماں ہفتہ بھر کے لئے رُک گئی۔ لالہ جی نے اپنی بہن کو نہیں آنے دیا تھا۔

پھر ایک بار رام لال اپنی بیوی کے ساتھ چنڈی گڑھ آیا اور دو روز تک ہمارے ہی پاس ٹھہرا۔ اُس کی بیوی شنو کماری بڑی سوشیل اور کم گو لڑکی تھی اور اُس کے پتا بھگواڑے میں ہارڈویر کی دُکان کرتے تھے۔ رام لال لالہ گوردھن لال کے ساتھ ہی دُکان پر کام کرتا تھا۔ زیادہ بیٹھے رہنے سے اُس کا پیٹ بڑھنے لگا تھا اور گال پھولنے لگے تھے۔ دو روز کے بعد جب رام لال اور شنو کماری چلے گئے تو ارادھنا نے اُن کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"شنو اپنی ساس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"یعنی میری ممانی سے؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں ڈرتی ہے؟"

"بات بات پر ٹوکتی رہتی ہے بے چاری کو۔"

"وہ تو اُس کی عادت ہے۔"

"اُسے یہ بھی طعنے دیتی ہے کہ وہ جہیز کم لائی ہے۔"

"تو کیا اُس کا باپ اپنی ساری جائداد رام لال کے نام لکھ دیتا؟" میں نے کھیج کر کہا۔

"ماما جی کا یہی خیال ہے شاید۔"

"بہت بے ہودہ خیال ہے۔"

اس واقعہ کے کوئی چھ مہینے بعد مجھے یہ خبر ملی ہے کہ شنو کماری اپنے ماں باپ سے ملنے مائیکے گئی تھی اور رام لال اُسے واپس نہیں لایا تھا پھر خبر ملی کہ شنو کماری کا والد خود اُسے سسرال چھوڑ گیا تھا۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ بیٹی دُکھی ہو تو بھگتنا ماں باپ کو پڑتا ہے۔

کچھ ہی مہینوں کے بعد رام لال اپنے کسی نجی کام کے لئے چنڈی گڑھ آیا اور ایک دِن کے لئے میرے ہی پاس رُکا۔ ارادھنا نے جب شنو کماری کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"وہ دوبارہ مائیکے چلی گئی ہے"

"کیوں گئی ہے بھائی صاحب؟"

"اُس کا من ہمارے گھر میں لگتا ہی نہیں"

"کوئی وجہ تو ہوگی آخر؟" میں نے پوچھا۔

"ماتا جی سے اُس کا جھگڑا رہتا ہے"

"جھگڑا کیوں رہتا ہے؟" میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

میرے سوال کے جواب میں رام لال نے بڑا تیکھا جواب دیا۔

"سو باتیں ہو جاتی ہیں گھر میں۔ آپ کے گھر میں بھی تو ہوتی ہونگی؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ارادھنا بول اٹھی۔

"ہمارے گھر میں تو کبھی جھگڑا نہیں ہوتا"

"تو اب کر لو" میں نے ارادھنا کو مخاطب کیا۔

"میں تو نہیں کروں گی"

"تو مت کرو"

میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بات طول پکڑ جائے گی بات کا رُخ بدل ڈالا اور لالہ گوردھن لال کی صحت کے بارے میں اور پرس رام کے کام کاج کے بارے میں بات چیت شروع کر دی اور ارادھنا اپنی پورن نوکرانی کا ہاتھ بٹانے کے لئے رسوئی میں چلی گئی۔

اِس دوران پرس رام کی شادی کی بات دو تین جگہ چلی اور ٹوٹ گئی معلوم ہوا کہ نیلامی کی بولیاں اُونچی نہیں گئی تھیں بیٹے بیچنے کا رواج قائم تھا۔ پھر ایک بار رکشا بندھن کے موقع پر ماں خود بھی ادھر گئی تھی اپنے بھائی کو راکھی باندھنے کے لئے۔ دو دن کے بعد واپس آئی تو بہت خوش نہیں تھی۔

"لگتا ہے، اس بار بھائی نے زیادہ خاطر نہیں کی" میں نے مذاق میں کہا۔

"نہیں، سنتوش، یہ بات نہیں"

"کیا لڑکیوں والا نام رکھا ہے تم نے میرا؟"

"نام سے کیا ہوتا ہے؟ گن ہونے چاہئیں۔ تم میں کتنا سنتوش ہے لالچ نہیں کرتے۔ بھگوان بھی تو خوش ہے تم پر"

"ماں تو خوش نہیں؟"

"میں کیوں خوش نہیں؟ میرے جتنا خوش قسمت کون ہے؟"

"پر تھوڑا بہت لالچ تو ہونا ہی چاہیئے ماں"۔
"اِسی لالچ نے تو میرے بھائی کے گھر کو نرک بنا ڈالا ہے"۔
"اب کیا ہوا؟"
"کپوری دیوی تو رام لال کی گھر والی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ کون سی کمی ہے گھر میں لیکن پھر بھی بہو کو کم جہیز لانے کے طعنے دیتی رہتی ہے"۔
"ٹکسال لگی ہے اُس کے مائیکے میں کیا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔
"وہ لوگ تو شاید یہی سمجھتے ہیں۔ اب پھر بے چاری کو مائیکے بھیج دیا ہے"۔
"اُن کی اپنی لڑکی کے ساتھ یہی سلوک ہوا تو پھر انہیں معلوم ہو گا"۔
"اِسی لئے تو اب پرس رام کی سودے بازی کر رہی ہے میری بھرجائی۔ جو کچھ اُدھر سے آئے اپنی لڑکی کے دے کر پیلا کر دے"۔
"دُکھ پائیں گے تیرے مائیکے والے ماں"۔
"اب کونسا سکھ پا رہے ہیں۔ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے"۔ ماں نے جواب دیا تھا۔
لیکن وہ بے حد دُکھی اور اُداس تھی۔
مجھے لگا جو کچھ ماں اپنے بھائی کے گھر دیکھ کر آئی تھی وہ سب کچھ اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کچھ نہ کچھ اپنے پاس بھی رکھ لیا تھا اور شاید اسی لئے زیادہ دُکھی تھی۔
میں بنیادی طور پر بڑا سیلف سینٹرڈ آدمی ہوں اور دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ پھر میرے اپنے پروفیشن کا بھی تو سوال ہے۔ ابھی میرا کام بھی تو پوری طرح سے نہیں جما۔ اس لئے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کیسز پر لگاتا ہوں اور رات دیر تک کام کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ارادھنا بھی چڑ جاتی ہے۔
"کسی بھی سمجھدار لڑکی کو وکیل سے شادی نہیں کرنی چاہیئے"۔
"کیشو کو بخار ہے۔ آپ کو بُلا رہا ہے"۔
"تم چلو میں آ رہا ہوں"۔
"آپ نہیں آؤ گے"۔
"کیوں نہیں آؤں گا"۔
"اس لئے آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ پیار اپنے مقدموں سے ہے"۔
"مجھے لگتا ہے تم بھی کوئی مقدمہ دائر کر دو گی میرے خلاف"۔
"میں نہیں کر سکتی نا۔ اسی لئے دُکھی ہو رہی ہوں"۔
ارادھنا منہ لٹکائے چلی جاتی ہے اور میں پھر ایف۔ آئی۔ آر کے صفحے اُلٹنے لگتا ہوں۔ میرا کل والا مقدمہ بڑی تیاری مانگ رہا ہے۔ جب میں تھک کر اپنے کمرے میں جاتا ہوں تو کیشو ٹبک ٹبک کر سو چکا ہوتا ہے۔

مجھے میرے پروفیشن نے بہت کاٹ ڈالا ہے اپنے ماحول سے۔

لگتا ہے میں ایک ویران جزیرہ بنتا جا رہا ہوں جہاں شاید بہت دنوں تک کوئی نہیں آئے گا۔ میں شاید تو دبھی قدم نہیں رکھوں گا اپنی شخصیت کے ویران جزیرے میں بہت دنوں تک۔ جبھی تو مجھے ایک عرصے تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لالہ گوردھن لال کے گھر کے حالات خاصے بگڑ چکے تھے۔

یہ تو ایک دن اچانک تار آیا تو معلوم ہوا کہ شنو کماری مر گئی تھی۔ میرے گھر میں تو کہرام مچ گیا۔ ماں اور میں جب تک جالندھر پہونچے، شنو کماری کا داہ سنسکار ہو چکا تھا۔ پتہ چلا کہ چائے بناتے وقت اس کی ساڑھی کو آگ لگ گئی تھی اور ہزار کوشش کے باوجود وہ بچائی نہ جا سکی تھی۔ لالہ گوردھن لال، شریمتی کپوری دیوی، شنو کماری کے خاوند رام لال، اس کے دیور پرس رام اور اس کی نند سرلا کماری سبھی کو اس کی موت کا بہت دکھ تھا۔ ماں اور میں زیادہ دیر تک نہ رک سکتے تھے کیونکہ ارادھنا بیمار تھی اور اُسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ ہم دونوں شام کو واپس آ گئے تھے۔

پھر ایک دن یہ خبر ملی کہ شنو کماری کے باپ نے پولیس کو یہ درخواست دی تھی کہ اُس کی بیٹی اچانک آگ لگ جانے سے نہیں مری بلکہ اُسے جلا کر مار اگیا تھا، اس لئے معاملے کی تحقیقات کی جائے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ معلوم ہوا کہ پولیس نے ان لوگوں کے خلاف کیس رجسٹر کر دیا تھا اور گھر کے سبھی افراد کو حراست میں لے لیا تھا۔ بعد میں لالہ گوردھن لال اور ان کی بیٹی سرلا کماری کو تو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن شریمتی کپوری دیوی، رام لال اور اُس کے بھائی پرس رام کو شنو کماری کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ جو چند دنوں کے بعد ضمانت پر رہا ہو گئے تھے۔

ماں نے مجھے کئی بار کہا کہ میں جالندھر جا کر ان لوگوں سے ملوں اور صحیح حالات جاننے کی کوشش کروں لیکن میں ٹالتا رہا۔

کیس کے بارے میں اخباروں میں بھی ذکر تھا۔ میں نے ارادھنا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ ماں کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتائے اور نہ ہی اس واقعہ کے متعلق اُس سے کوئی بات کرے۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور اس طرح ماں اپنے بھائی کے گھر کے حالات کے بارے میں بے خبر رہی۔

گیٹ کے باہر کار کے رکنے کی آواز میں نے سُنی۔

پھر کال بیل بجی

میں ابھی ابھی ہائی کورٹ سے لوٹا تھا اور بے حد تھکا ہوا تھا۔

سوچا کوئی مؤکل ہو گا جسے اگلے دن کی پیشی کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو گا۔ دروازہ کھولا۔ تو سامنے لالہ گوردھن لال کا تمام کنبہ کھڑا تھا۔ اُس وقت میرے ذہن کی کیفیت وہ تھی جو ریلوے لائن پار کرتے ہوئے اس شخص کی ہوتی ہے، جس کی پتلون کی موہری کا ایک حصہ پٹری میں پھنس گیا ہو اور کسی بھی طرح نہ چھوٹ رہا ہو اور سامنے سے انجن دھاڑتا ہوا تیزی سے اس کی طرف بڑھتا آ رہا ہو۔ بس چند لمحوں کا وقفہ ہو زندگی اور موت کے درمیان۔

مجھے لگا جیسے دروازہ کھولتے سمے میرے پاؤں کو بھی کسی پٹری نے دبوچ لیا تھا مجھے لگا جیسے میں اپنے مہمانوں کو اندر آنے کے لئے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ انہیں چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکار رہا تھا کیوں کہ اس وقت میری جان خطرے میں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ پھر وہ سب بڑی شکستہ دلی سے اندر داخل ہوئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا انہیں ڈرائینگ رُوم میں بٹھا کر ماں کو اُن کے پاس بھیجا۔ ارادھنا گھر میں نہیں تھی۔ وہ کیشو کو ساتھ لے کر کچھ ہی دیر پہلے، آٹھ سیکٹر میں اپنے بھائی کے گھر گئی تھی۔ وہاں کوئی پارٹی تھی اور تھوڑی دیر میں مجھے بھی وہاں پہنچنا تھا۔ لیکن اب کہاں ممکن تھا وہاں پہونچنا۔ میں فوراً باتھ رُوم میں گھس گیا اور دیر تک اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ سارے کا سارا خاندان کیوں آیا تھا میرے گھر۔ کچھ دیر کے بعد جب میں ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو سب لوگ چائے پی رہے تھے لیکن لالہ گوردھن لال کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں۔ جیسے انہیں بڑی بے قراری سے میرا انتظار تھا۔

"سنتوش کمار مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" لالہ گوردھن لال نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے تو پی لیجئے ماما جی۔"

"چائے اتنی ضروری نہیں ہے۔"

"تو فرمائیے۔"

"چلو تمہارے دفتر میں بیٹھتے ہیں۔"

میں اُنہیں لے کر باہر والے کمرے میں آ گیا جو میرا دفتر ہے۔ اور دیوار کے ساتھ لگی الماریوں میں قانون کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہی کتابیں کچہری میں میری مدد کرتی ہیں۔ ان کے درمیان بیٹھ کر میں اپنے آپ کو بڑا محفوظ محسوس کرتا ہوں۔ میں نے لالہ جی کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی اُن کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہئے کیا بات ہے ماما جی؟" مجھے لگا میرا لہجہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"تم بہت گھبرائے ہوئے لگتے ہو؟"

"آج بہت کیس تھے۔ تھک گیا ہوں۔"

"تم پر میرا بہت حق ہے سنتوش کمار۔"

"اس میں کیا شک ہے ماما جی۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بھی اس بات کا احساس ہے۔"

"آپ کے تو اتنے احسان ہیں مجھ پر۔ میں زندگی بھر نہیں اُتار سکتا۔"

"بس انہیں کا خیال کر لو۔"

"آپ ہی تھے تو ایک بے سہارا اور غریب لڑکے کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ فخر سے زندہ ہے۔ آپ کا بہت بڑا

قرضہ ہے مجھ پر۔"

"میں قرضہ تو واپس نہیں مانگ رہا۔ صرف سُود مانگنے آیا ہوں۔"

ہوشیار دکاندار اصل کی بات تو کبھی کرتا ہی نہیں صرف سُود کی بات کرتا ہے۔ اصل تو وصول ہو ہی جائے گا۔ سُود نہ ڈوب جائے کہیں۔

لالہ گوردھن لال نے بڑا گہرا وار کیا تھا۔

"آپ حکم کریں ماماجی۔" مجھے لگا جیسے میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

"تمہاری مامی اور ان دونوں چھوکروں نے مل کر مارا ہے اُس معصوم لڑکی کو۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!" میں چیخا۔

"بہ حکومت میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے۔"

"تو عدالت میں اقبال کر لیجئے۔"

"نہیں کر سکتا۔ سب پھانسی چڑھ جائیں گے ان ظالموں نے تو اُس کے مرتے وقت کے بیان بھی اپنی مرضی سے دلوائے تھے۔ اُسے دھمکی دی تھی کہ اگر اُس نے کسی کے خلاف بیان دیا تو وہ اس کے باپ کو بھی مروا ڈالیں گے۔"

"ظالم تو آپ ہیں ماماجی جو ان لوگوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی تو ہوتا رہا ہے۔" میں حیران تھا کہ اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی مجھ میں کہ میں لالہ جی کے سامنے اس گستاخی سے بول رہا تھا۔

"سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا ہے سنتوش کمار۔" انہوں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو بھگتئے اب۔"

"نہیں بھگت سکتا۔"

"تو میں کروں؟"

"تم اس کیس کی پیروی کرو۔ کسی بہت تگڑے وکیل کو اینگیج کر دو۔"

"نہیں کر سکوں گا ماماجی۔"

"منہ مانگی فیس دوں گا۔"

"اسی رقم سے جو آپ سنتو کماری کے باپ کے گلے پر چھری رکھ کر وصول کرتے رہے ہیں؟"

"تمہاری ماں کا تمام خاندان تباہ ہو جائے گا سنتوش کمار۔"

"ہو جانے دیجئے۔"

"میری بات مان لو۔ اس کیس کو سنبھالو اور کسی دوسرے قابل وکیل کو ساتھ لے لو۔"

یہ کہہ کر لالہ گوردھن نے نوٹوں کا ایک بڑا سا پلندہ جیکٹ کی اندر والی جیب سے نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

"میری نیلامی مت کیجئے ماماجی۔ اس پلندے کو سنبھال لیجئے۔" میں ایک بار پھر چیخا جیسے اپنے زندہ ہونے کا

ثبوت مانگ رہا ہوں اپنے آپ سے۔

لالہ جی نے بڑی حقارت سے میری طرف دیکھا اور نوٹوں کا پلندہ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔
"مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنے نمک حرام ثابت ہوگے۔" اُن کی آواز میں کرختگی تھی۔ میں خاموش تھا۔ میری زبان ہی جیسے کٹ گئی تھی۔

"تم تو آستین کے سانپ نکلے۔"

میں چُپ تھا۔ لگ رہا تھا جیسے میری کٹی ہوئی زبان سے رِستا ہوا خون میرے منہ میں بھر گیا تھا۔
"جس سنتوش کمہار کو میں نے کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر پالا تھا وہ آج مر گیا ہے۔"
مجھے لگا جیسے میری کٹی ہوئی زبان کا تمام خون میرے حلق میں جمتا جا رہا تھا۔ میرے ہونٹ کسی نے سی ڈالے تھے۔
"مردود بولتے کیوں نہیں۔ سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟" لالہ جی گرجے۔

واقعی مجھے سانپ نے ڈس لیا تھا اور سارا زہر میری رگوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ میں اپنی کرسی سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا ہوں۔ گیٹ سے بھی باہر آگیا ہوں۔ لالہ گوردھن لال کوٹھی کے اندر چلے گئے ہیں جہاں ان کے خاندان کے سب لوگ میری ماں کے پاس بیٹھے ہیں۔

"نکل چلو اس گھر سے۔ ان کمینوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔" لالہ جی نے نفرت اور غصّے سے کہا۔ اُن کے خاندان کے سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟"

"تمہارے کپوت نے میرے مُنہ پر تھوک دیا ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔"

"کُتّا اپنی اوقات بھول گیا ہے۔"

میری بھولی، سادہ، اَن پڑھ بوڑھی ماں کچھ نہیں سمجھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے ہیں۔ اُس کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن میں گھر میں ہوں کہاں جو اُسے نظر آؤں۔
میں تو سائیڈ لین میں ایک طرف اپنی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن میں سب کو دیکھ رہا ہوں اپنی اندھی ویران آنکھوں سے اور اُن کی باتیں سُن رہا ہوں اپنے بہرے کانوں سے۔

جو پانچ آدمی کچھ دیر پہلے کار سے اُترے تھے، میرے گیٹ کے سامنے، وہ دوبارہ کار میں بیٹھ گئے ہیں۔ لالہ گوردھن لال نے کار اسٹارٹ کر دی ہے۔ میری بوڑھی ماں گیٹ کے باہر ہاتھ جوڑے خاموش کھڑی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جل رہے ہیں لیکن اُن پانچوں میں سے کوئی بھی اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا اور اُسے معلوم نہیں کہ وہ سب لوگ اچانک ہی اتنے کٹھور اور سنگدل کیوں ہو گئے ہیں۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو مجھے لگا وہ سڑک کی طرف نہیں بڑھی بلکہ سائیڈ لین کی طرف مُڑی ہے جہاں

میں اپنی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور میرے ماتھے پر پسینہ ہی پسینہ اُبھر آیا ہے۔ لالہ گوردھن لال نے پورے زور سے کار کو میری طرف گھمایا ہے اور بلند آواز سے چیخے بھی ہیں۔

”کُتے، کمینے، کچل کے چھوڑوں گا تجھے۔“!

میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا کیونکہ میرے پاؤں میں کیلیں گڑی ہیں۔ میں زور سے چیخا ہوں اور کار پوری رفتار سے مجھے کچلتے ہوئے سامنے کی صاف، کھلی اور سنسان سڑک پر دوڑنے لگی ہے

میری نظروں کے عین سامنے سنتوش کمار اگروال اینڈ وکیٹ کی موت ہوئی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اُس کی لاش شمشان بھومی میں جلی ہے اور اُس کے معصوم بیٹے کیشو نے اُس کی چتا کو آگ لگا دی ہے۔ جسے زندگی اور موت کے آپسی رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں۔

اُس کی گرم گرم راکھ میں سے ایک نیا سنتوش کمار جنم لے رہا ہے۔ اور اُسے اس بات سے انکار نہیں کہ اُس کے ماموں نے اُسے ایک دن کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر ہیرا بنا دیا تھا لیکن اُسے شنو کماری کے قاتلوں کے ٹولے میں شامل ہونے سے سراسر انکار ہے۔

●●●

مُٹھّی بھر دُھوپ

ابھی کچھ دیر پہلے وہ مُٹھّی بھر دُھوپ اس بے دردی سے مجھ پر پھینک گیا ہے کہ اب تک چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی تیز کرچیاں میری آنکھوں میں چبھ رہی ہیں۔ لگتا ہے روشنی کی خشک ابرق آلود ریت میرے پپوٹوں کے اندر گھس کر چھوٹے چھوٹے زخم بناتی جا رہی ہے اور میری آنکھوں میں سُرخ خون کے ڈورے لہرانے لگے ہیں اور ننگا ہوں کے سامنے زخموں کے پھول کھل رہے ہیں۔

"کوئی پُوچھ رہے ہیں آپ کو سُنیتا بی بی۔" ملازمہ نے اندر آ کر کہا تھا۔

"کون ہیں؟"

"نام نہیں بتایا۔"

میں نے سوچا وہی انشورنس والا ہوگا۔ کم بخت کئی ہفتوں سے پیچھے پڑ رہا تھا۔ یہ انشورنس ایجنٹ بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ آپ جتنا انہیں پرے جھٹکیں گے وہ اتنا ہی ساتھ چمٹتے جائیں گے۔ گندم کے ادھ پکے خوشے کی طرح جو ایک بار جسم سے چھو جائے تو کھال پر خراشیں ڈال کر ہی چھوڑتا ہے۔ یہ انشورنس ایجنٹ بھی آپ کی عمر کے نازک نازک لمحوں پر تفصیلات کی خراشیں ڈالے ہی جاتے ہیں جب تک کہ آپ اپنی عمر کا پیرہن اتار نہیں پھینکتے۔ ویسے یہ انشورنس ایجنٹ شکل صورت کا بھی اچھا ہے اور باتیں بھی اچھی کرتا ہے۔ آ جائے تو دس پانچ منٹ بات کر لیتی ہوں۔ پچھلے ہفتہ بڑے ہی خوبصورت کیلنڈر اور نہایت ہی پیاری سی امپورٹڈ ڈائریاں دے گیا تھا۔ کیلنڈر تو میں نے بانٹ دیئے ہیں لیکن ڈائریوں پر برنارڈ شا کے ڈراموں کے خوب صورت جملے نوٹ کرتی رہتی ہوں۔

لیکن وہ انشورنس ایجنٹ نہیں تھا۔

میں جب نیم اندھیرے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تو میری آنکھیں چوندھیا سی گئیں۔ تیز دھوپ کا ایک بگولہ روشنی سے بھرپور میری نظروں سے ٹکرایا۔ پل بھر کو میں ہونچکی سی رہ گئی۔ آنکھوں سے گاگلز اتارے، فریم کو انگلیوں میں اٹکائے۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس تھامے وہ ایک ستون کی طرح کھڑا تھا۔ میرے قدم جم گئے اور زبان گنگ ہو گئی۔ میں ساڑھی کا پلّو

سنبھالتی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔

"کیا میں واپس چلا جاؤں؟" ستون سے آواز آئی۔

میں خاموش رہی۔

"اچھا خدا حافظ۔" وہ جانے کو مڑا۔ اس کی پشت میرے سامنے تھی۔

"سنو!" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ رک گیا۔ اور پھر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

"وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر کیوں نہیں آتے؟"

"دھوپ سینک رہا ہوں۔" وہ مسکرا دیا اور اسی لمحہ مٹھی بھر دھوپ اس نے میری آنکھوں میں پھینک دی۔ جون کے پہلے ہفتہ کی تپتی ہوئی وہ ریت میری روح کی گہرائیوں میں بھر گئی اور میرا ذہن و جسم جل اٹھا۔

"جون میں بھی دھوپ سینکتا ہے کوئی؟"

"ہاں، وہ جسے دسمبر میں یہ نعمت نصیب نہ ہو۔"

اور وہ ستون دھیرے دھیرے سرکتا ہوا میرے قریب آ گیا اور میرا جی چاہا کہ اس جلتے ہوئے ستون پر اپنے لمبے سیاہ بالوں کا سایہ ڈال دوں۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مدتوں پہلے والی مسکراہٹ تھی جس کی چمک وقت کے غبار میں دب کر بھی زندہ تھی۔ وقت کے غبار میں دب کر بھی زندہ رہنا، اپنی دھڑکنوں کو محسوس کرنا، زندگی کے بوسوں کی لذت کو یاد رکھنا کتنی عظیم چیز ہے۔ کتنے سخت جان ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھ پے بہ پے چوٹیں کھانے کے باوجود زندگی کے آنچل کو نہیں چھوڑتے۔ جب صحرا میں جلتی ہوئی لوؤں کے بعد ریت کے ڈھیر مٹ جائیں تو زندگی کا چہرہ گرد و غبار جھاڑ کر ایک بار پھر چمک اٹھے۔ اس سے بڑھ کر بھی ہے کچھ دنیا میں؟

وہ جب برآمدے سے گذر کر نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ماتھے پر جمے پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔

"پسینہ تو پونچھ ڈالو اپنا۔"

"یہ قطرے تو وہ سنگِ میل ہیں جن کے پاس سے گذر کر یہاں تک پہونچا ہوں۔ انہی سے تو میں نے سفر کی طوالت کو ماپا ہے۔

ساقی نہ پوچھ کس طرح پہونچے ترے حضور

رستے میں اک طویل بیابانِ ہوش تھا۔"

"سبحان اللہ!" میں زور سے ہنس دی اور گولرے ٹھنڈے کمرے میں اس کے پسینے کے قطرے موتی بن گئے۔

اس نے گاگلز پاس تپائی پر رکھ دیئے اور بریف کیس صوفے پر پٹک دیا۔

"اس طرح ٹپکنے سے کچھ ٹوٹ جائے تو؟"

"ٹوٹنے والی چیزیں تو کب کی ٹوٹ چکیں۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے ٹوٹنے کو۔"

"ٹوٹنے کو تو سدا ہی کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے"

"وہ تو جُڑنے کو بھی رہ جاتا ہے" وہ بولا۔

"کیا رہ جاتا ہے جُڑنے کو؟"

"انسانی رشتوں کے کچھ دھاگے"

"اس کچے سُوت کا کیا بھروسہ ہے؟"

"احساسات کے کچے سُوت سے زندگی اپنے لئے بڑے خوبصورت پیرہن تیار کرتی ہے سُبیتا! جن میں پیار کی خوشبوئیں اور بہار کے رنگ رچے ہوتے ہیں"

اُس کی یہ بات سُن کر جانے کیوں میں نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ دیر تک سہلاتی رہی اور پھر اُس کی پشت کو چوم کر چھوڑ دیا پھر میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ میری کچھ لمحوں کی غیر حاضری میں یقیناً کمرے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میں جب سکوٹش کے دو گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں واپس آئی تو وہ دیوار کے سامنے کھڑا ایک پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تصویر زندگی کی طرح ننگی ہے"

اُس کی یہ تنقید سُن کر میں سناٹے میں آگئی

"اِس کو کپڑے پہنانے کی کوشش نہ کرنا"

میں اب بھی خاموش تھی اور ٹرے میں لبالب بھرے گلاس لرز رہے تھے۔

"یہ کپڑے پھاڑ کر بھی باہر نکل آئے گی"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں خود نہیں جانتا میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور جو جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس کی بات کوئی نہیں سمجھتا"

میں دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے اُس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے میرے بائیں گال کو تھپتھپایا اور ایک گلاس ٹرے سے اُٹھا لیا۔

"سکوٹش کا رنگ گلابی ہو گیا ہے نا؟"

میں نے محسوس کیا میرے گال تمتما اُٹھے تھے۔ میں نے دوسرا گلاس ہاتھ میں لے کر ٹرے ایک طرف رکھ دی۔

"اتنے برس کہاں رہے تم؟"

"بن باس کاٹتا رہا، سوچا تمہارا اپنی مون کا نشہ اُتر جائے تو پھر وطن لوٹوں"

اُس نے نہایت ہی خوبصورت لائٹر سے وہی پُرانے برانڈ والا گھٹیا سا سگرٹ سُلگایا اور دھوئیں کا ایک گہرا غبار چھوڑ دیا جو کمرے کی خُنک فضا میں ایک بوجھل بدلی کی طرح لہراتا رہا۔

"تم اب تک یہی سگرٹ پیتے ہو؟"

"بڑا دقیانوسی قسم کا آدمی ہوں، بہت ترقی پسند ہوتا تو اب تک بیرڑی پر آ گیا ہوتا۔"

"کتنا ٹھوس پن ہے تمہاری شخصیت میں۔ تم کسی سانچے میں ڈھلتے ہی نہیں۔"

"بس ایک ہی سانچا ہے، اُس میں ڈھل کر اب ایک ہی طرح کی ساخت بن گئی ہے۔ اب تو صرف ٹوٹ ہی سکتا ہوں" اور وہ ایک دم زور سے ہنس پڑا۔

"ارے ہاں! وہ تمہارے خاوند قسم کے صاحب کہاں ہیں؟"

"آسٹریلیا میں۔"

"اُون کا کاروبار کر رہے ہیں کیا؟"

"شاید۔!"

"لیکن اُن کی اعلیٰ نسل کی بھیڑ تو ہندوستان میں ہے۔"

"پلیز!"

اور وہ اتنے کھلے گلے کی ہنسی ہنسا کہ میری روح کے تمام زخم کھل گئے۔

"تم کیوں نہیں ساتھ چلی گئیں، اس گھٹے ہوئے ماحول میں کیوں سڑ رہی ہو؟"

"گناہ تو ہر آدمی کرتا ہے، لیکن ہر آدمی اپنے لئے سزا خود تجویز نہیں کرتا۔"

"اِسی لئے تو عدالتوں کی اِنسٹی ٹیوشن قائم ہے۔"

"لیکن ایک عدالت ایسی بھی ہے جس میں صرف ملزم ہی ملزم ہیں، جج کوئی نہیں۔" میں نے کہا

"اور میں نے اُسی عدالت کے فیصلے پر اتنے برسوں کا بن باس کاٹا ہے۔" وہ بولا۔

"اور میں نے زندگی کی روشوں پر ببول اُگائے ہیں۔"

"تاکہ بن باس میں رہنے والوں کے پاؤں میں کانٹے چبھتے رہیں۔"

اُس کی یہ بات سن کر میرے کھلے ہوئے زخموں سے خون اُبل پڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے آگے سرک کر، اپنے ہونٹ میری آنکھوں پر رکھ دئے۔

"آنسوؤں میں نمک بھی ہوتا ہے سُنیتا، یہ میں نے آج جانا ہے۔"

"زندگی میں یہی بات جاننا مشکل ہے۔"

"اور جو یہ بات جان لیتا ہے اُسے زہر کا پیالہ ملتا ہے۔"

"میں نے ان تمام برسوں میں گھونٹ گھونٹ زہر پیا ہے اور زہر سے ہی اپنے زخم دھوئے ہیں۔ اِسی لئے تو اتنے صاف ہیں میرے زخم۔" میری آواز میں کپکپی تھی، میرا سر اُس کے سینے پر ٹِکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میرے بالوں میں تھے اور اس کے ہونٹ میری آنکھوں سے سرک کر میرے ماتھے پر جم گئے تھے۔

وہ پانچ برس کے بعد ملنے آیا تھا مجھے۔ کسی پرائیویٹ فرم سے وابستہ ہے۔ چار سال امریکہ میں رہ کر اپنے مُلک میں

لوٹ آیا تھا۔ کچھ دیر وہ امریکہ میں گذارے ہوئے دِنوں کی باتیں سناتا رہا۔ وہاں کے نظام کی، ادب کی، فلم کی، کلبوں کی، سبھی کچھ اپنے ایک آدھ رُومان کی کہانی بھی۔

"آتی بار وہاں سے کِسی کو ساتھ کیوں نہیں لے آئے؟"

"زندگی بھر کا ساتھ نبھانا مشکل ہے۔ میرے جیسا آدمی ایڈجسٹ ہی کہاں کر سکتا ہے کسی سے؟"

"ایڈجسٹمنٹ تو زندگی کی بہت بڑی ضرورت ہے۔"

"ضرورتیں جتنی کم ہوں زندگی اتنی آسودہ رہتی ہے۔"

"تو جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی واپس آ گئے ہو؟"

"نہیں۔ میرے دل پر تجربات کی تحریریں ہیں، جنھیں پڑھ کر لُطف اندوز ہو لیتا ہوں۔"

پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ ملازم نے کھانا کِھلا دیا۔ دن میں آرام کرنے کی اُسے عادت نہیں۔ دِن بھر گھومتے رہنا یا پڑھتے رہنا، یہ اس کا پرانا دھندہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر پھر اُسی کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ سگرٹ پھُونکے جا رہا تھا اور باتیں کئے جا رہا تھا۔

"اب تم مکمل عورت لگتی ہو۔ جب میں تم سے آخری بار ملا تھا تم ایک معمولی سی لڑکی تھیں۔ اِن پانچ برسوں میں تم میں کتنا انقلاب آ گیا ہے۔"

"جسم کا انقلاب بھی اگر انقلاب ہے تو تم پہلے سے کمسن نظر آتے ہو۔ لگتا ہے جیسے فاقے کاٹتے رہے ہو۔"

"کیا جھگڑا ہو گیا تھا تمہارا خاوند سے؟"

"اُس کے منہ سے بڑی تیز بُو آتی تھی اور وہ دِن میں مجھے بیسیوں بار چومنا چاہتا تھا۔"

"جھگڑے کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔"

"اور دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہوا کہ اُس کے مُنہ سے آتی ہوئی یہ تیز بُو دراصل اُس کی زندگی کی بنیاد تھی۔ اُس کے نظریات، اُس کی قدریں، اُس کا اخلاق، اس کی عادتیں، سب میں ایک تیز، گندی اور تعفن سے بھری بُو تھی اور میں نے بدبُو سے ہمیشہ نفرت کی ہے، تم تو یہ بات جانتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور؟"

"اور کیا۔ مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اگر میں اس شخص کے ساتھ کچھ عرصہ رہ گئی تو میری رگ رگ میں بدبُو سرایت کر جائے گی۔ اور میرے خون میں سڑاند بھر جائے گی اور میرا دل گندے خُون کا ایک جوہڑ بن جائے گا۔ وہ جب بھی مجھے پیار کرنے کی کوشش کرتا مجھے لگتا جیسے ایک نہایت گندے جوہڑ میں جونکیں مٹی سے چمٹ کر دھرتی کا رس نچوڑنا چاہتی ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، خاک، میں نے سیپریشن لے لی۔"

"پھر؟"

"پھر تمہارا سر!" میرے منہ سے بڑی تلخی سے یہ الفاظ نکلے۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ اور پھر میں ایک دم پھوٹ پڑی۔ اتنا شاید میں اُس روز بھی نہیں روئی تھی جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ماں جو کینسر کی مریض تھی اور جس نے میرے لئے ایک ایسا خاوند چُنا تھا جس کی تمام زندگی ایک بہت بڑا کینسر تھا۔

"تمہاری سیپریشن کی خبر مجھے ملی تھی لیکن تفصیل معلوم نہیں تھی۔"

"تفصیل سُن کے تو بہت خوش ہوئے ہونا؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب تم اُس تصویر کو کپڑے پہنانے کی کوشش نہیں کرو گی، وہ تصویر جو تمہارے سامنے ہے۔ زندگی جیسی ہے اُسے ویسی ہی رہنے دو۔ جلد کی بیماریوں کو قیمتی کپڑوں اور تیز خوشبوؤں سے مت چھپاؤ۔"

"اوِیناش!" میں نے پہلی بار اُس کا نام لیا تھا۔ پانچ برس کے بعد اُسے پکارا تھا۔ میں نے اُسے چاہا تھا لیکن چاہت کو چُھپاتی رہی تھی۔ اپنے معصوم اُجلے پیار کو دھوکوں سے ڈھانپتی رہی تھی اور ایک دن میرے پیار کی تصویر نے کپڑوں کے وہ انبار نوچ کر پھینک دیئے اور آدم زاد ننگا میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس دِن سے میں نے محسوس کیا کہ پیار کو کبھی لباس کی ضرورت نہیں۔

اُس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا ذہن اُس کے دِل کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے لگا اور اپنے گُنبد میں گذشتہ کھوئی ہوئی گونجوں کو ٹٹولنے لگا۔

"میں نے سوچا تھا آج معلوم کروں کیا تم نے اپنے بے خواب کواڑ مقفل کر دیئے تھے یا ابھی کسی روزن سے دھوپ اور چاندنی کی کوئی پرچھائیں اندر رِس سکتی تھی۔"

"کر لیا معلوم تم نے؟"

"ہاں"

"کیا!"

"کہ اب مجھے فوراً چلے جانا چاہیئے۔"

اُس نے یہ کہہ کر جیسے میرا گلا گھونٹ دیا تھا۔ میرے حلق میں الفاظ اٹک رہے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ کہ ابھی چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے تمہیں خطوں کا ایک پلندہ دینا چاہتا ہوں جو میں نے تمہیں ان پانچ برسوں میں لکھے ہیں لیکن پوسٹ نہیں کئے۔ انھیں پڑھ چکو گی تو پھر آؤں گا۔ وہ وقت مناسب ہو گا کہنے کا۔"

یہ کہہ کر اُس نے بریف کیس میں سے ایک پیکٹ نکالا اور تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور اُٹھا کر اپنے پہلو میں دھر لیا۔

"لیکن آج تو رُک جاؤ۔"

"نہیں۔ ابھی میرا بن باس پورا نہیں ہوا۔ ابھی تمھارے اُگائے ہوئے ببولوں کے کچھ کانٹے میرے خون کے پیاسے ہیں!"

اور وہ بغیر کسی تمہید کے اُٹھ کھڑا ہوا صرف ایک بار مجھے اپنی بانہوں میں لے کر میری مانگ کو چوم لیا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مضبوطی سے دبا دیا۔

میں برآمدے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور ظالم نے گیٹ بھی بند نہیں کیا۔ مُڑ کر دیکھا بھی نہیں اور مضبوط قدم اُٹھاتا سامنے والی سنسان سڑک پر چل پڑا۔ میں بہت دیر برآمدے میں کھڑی رہ کر کمرے میں واپس آگئی اور خطوں کے اُس پیکٹ کو کھولا۔ اُس نے خطوں کو تاریخ وار تہ کر رکھا تھا۔ جیسے ہر خط کسی ناول کا باب ہو۔ پہلے خط پر درج وہی تاریخ تھی جس تاریخ کو میری شادی ہوئی تھی اور جس تاریخ کو اُس نے مجھے آخری بار چوم کر کہا تھا۔

"زندگی کا فوکس مت بگڑنے دینا۔"

اور اُس کے بعد میری نظریں اُسے ڈھونڈتی رہی تھیں اور وہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور میں اُس کی صورت کو بھی ترس گئی تھی۔

آخری خط دو مہینے پہلے کا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی جانے کتنی ہی ویران خطوں کو پڑھتی رہی اور مجھے محسوس ہوتا رہا جیسے میں نے یہ پانچ برس اونیاش کے ساتھ گذارے ہیں اور دن رات ہر گھڑی اُس کے پاس رہی ہوں اور اُس کے دُکھ درد میں شریک رہی ہوں جیسے اونیاش اور میں کبھی الگ ہوئے ہی نہ تھے۔ لگ رہا تھا جیسے میں ایک داستان پڑھ رہی تھی، جو میری داستان تھی اور جو میں نے خود لکھی تھی۔

اور اِس وقت اُس کے آخری خط کی آخری سطریں میرے سامنے ہیں۔

"مجھے بھی ڈر ہے کہ تمہاری وہ تصویر جو میرے ذہن میں محفوظ ہے اور جسے میں نے صبح و شام دیکھا ہے، چاہا ہے، پُوجا ہے، کہیں غبار سے دُھندلا نہ گئی ہو۔ مجھے اُس تصویر میں کہیں ذرا سی بھی تبدیلی نظر آئی تو میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لوں گا سُینتا! اور تمھاری تصویر کو انسانی رشتوں کے بہت وسیع کھنڈر میں پھینک کر زہر پی لوں گا ــــــــ"

وہ نہیں جانتا کہ میں نے تو خود تمام زندگی زہر پیا ہے اور احساسات کو زہر میں بھگو کر اپنی تصویر کو صاف و شفاف رکھا ہے۔ کسی سائے تک کا نقش نہیں جمنے دیا اُس پر۔ کاش یہ سب باتیں وہ مجھ سے ویسے ہی کر لیتا۔ بجائے اس کے ذہن میں تذبذب اور اندیشے لے کر کسی اگلی ملاقات کا بھروسہ دلا کر یوں اچانک الگ ہو جاتا۔

سُورج غروب ہو چکا ہے۔ سائے بھی ڈھل چکے ہیں لیکن میری آنکھوں میں اُس مُٹھی بھر دُھوپ کی کرچیاں ابھی تک چُبھ رہی ہیں جو اُس نے آتے ہی بڑی بے دردی سے مجھ پر پھینک دی تھی ::

راتِ کے مُسافر

”میں انل بھرانی بول رہا ہوں۔ اندور سے آیا ہوں“، ٹیلیفون پر ڈاکٹر انل نے بتایا۔
”کب پہنچے ہو بھائی؟“
”دو روز ہو گئے“
”ڈاکٹر اگروال نے تو لکھا تھا کہ تم چنڈی گڑھ پہنچتے ہی میرے پاس آؤ گے“
”ایک دوست ساتھ تھا۔ اُس کی سُسرال میں رُک گیا“
”سُسرال تو کسی کی بھی ہو۔ بڑی پُرکشش ہوتی ہے ——“
میری بات پر ڈاکٹر انل بھرانی ہنسا۔ اُس کی ہنسی جوان اور دلکش تھی۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔
”میری رہائش کا انتظام ہو گیا کیا؟“
”ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔ مہینہ بھر تو رہنا ہے تم کو۔ کونسا سال بھر کا پروگرام ہے تمہارا چنڈی گڑھ میں“
”لیکن سر! اپنا ٹھکانا تو ہونا ہی چاہیئے“
”وہ بھی ہو جائے گا۔ تم اپنے دوست کی سُسرال چھوڑ کر میرے ہاں چلے آؤ“
بس اتنی گفتگو کے ساتھ ہی ٹیلیفون کٹ گیا اور پھر ڈاکٹر انل سے کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ میرے پاس ٹھہرا۔
انل میرے ایک دوست کا لڑکا ہے۔ اور اندور میڈیکل کالج میں لیکچرار ہے۔ چنڈی گڑھ کی پوسٹ گریجویٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ڈائلیسز کی ٹریننگ لینے آیا تھا۔ وہاں میڈیکل کالج میں ڈائلیسز کی مشین تو تھی لیکن استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ جو ڈاکٹر سرکار کے خرچ پر امریکہ سے ٹریننگ لے کر آیا تھا۔ وہ سال بھر ہوا۔ کالج سے استعفیٰ دے چکا تھا۔ اور اب جواہر مارگ پر پرائیویٹ پریکٹس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر انل بھرانی میڈیسن میں ایم ڈی کر چکا تھا اور چنڈی گڑھ میں اسے ڈائلیسز کی ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا کہ ڈائلیسز کی مشین جو سال بھر سے بے کار پڑی تھی استعمال میں لائی جا سکے اور مریض اس سہولت کا فائدہ اُٹھا سکیں۔

ڈاکٹر انل میرے پاس ٹھہرا تو نہیں تھا۔ لیکن ہر تیسرے دن مجھے ملنے ضرور آتا تھا۔ اور نیفرالوجی کے بارے میں بات چیت کرتا رہتا تھا۔ ایک شام کو آیا تو کہنے لگا:

"میرے ساتھ ہسپتال چلیے۔ ایک مریض کی آپ سے ملاقات کراؤں"

مجھے رینل فیلیور سے متعلق انل سے کئی بار بات کرنے پر اس بیماری کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کرنے اور مریضوں سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ خاص طور پر ڈائلیسز کے پروسیس کو جاننے کا اشتیاق تھا مجھے۔

"بس ایک ہی مریض سے ملواؤ گے؟" میں نے پوچھا

"ملواؤں گا تو آپ کو تین چار مریضوں سے۔ لیکن ایک مریض سے خاص طور سے ملواؤں گا"

"وہ کون ہے"

"ایک لڑکی ہے جس کی شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں ــــــ"

"اس کا کوئی بچہ ہے" میں نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔ رینل فیلیور کی مریض عورتوں کے عام طور سے اولاد نہیں ہوتی"

"کیوں ــــــ؟"

"وہیں وارڈ میں بتاؤں گا"

ڈاکٹر انل کی عمر یہی کوئی تیس کے قریب ہوگی لیکن لگتا تھا اس نے اپنے پروفیشن میں خاصی سادھنا کی تھی۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ کافی میچور تھا۔

میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے وہ مجھے ڈائلیسز روم میں لے گیا۔ جہاں مشینیں رکھی تھیں وہ مجھے ان کے استعمال کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔

پھر وہ مجھے وارڈ میں لے گیا جہاں دو مریض تھے۔

پہلا مریض موہن لال تھا جو بہار سے آیا تھا اور وہاں ٹرانسپورٹ کے محکمے میں کلرک تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے اس کے گردے فیل ہو چکے تھے۔ اور اس کی بائیں ٹانگ میں ٹخنے سے اوپر کے حصے میں آرٹریو وینس شنٹ لگا کر ڈائلیسز کیا جا رہا تھا۔ ہفتہ میں دو بار شنٹ والے حصے میں انفیکشن ہو جانے سے اسے کافی تکلیف تھی۔ اس کی دیکھ بھال اس کی بیوی کر رہی تھی۔ جو ڈاکٹر انل کے کہنے کے مطابق اب اتنی پُرامید نہیں تھی۔ جتنی کہ وہ اس وقت تھی جب پٹنہ کے ڈاکٹروں نے اسے چنڈی گڑھ بھیجا تھا۔

دوسرا مریض حنیف تھا جو علی گڑھ سے آیا تھا۔ جب میں اسے ملا تو وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک دم اکیلا تھا۔ آج ہی اس کا ڈائی لیسز ہوا تھا۔ جس میں اسے کافی تکلیف ہوئی تھی، وہ بڑا مضمحل اور اداس لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا چہرہ بڑا خوبصورت تھا۔ اور اس کے لمبے لمبے بکھرے ہوئے سیاہ بال اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر ایک بار ڈاکٹر انل کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کہہ رہا ہو اب

آپ جائیے۔

میں چنڈی گڑھ میں رہتے ہوئے بھی آج پہلی بار نیفرالوجی ڈیپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ وہ مریض جس سے دراصل ملوانے کے لیے انل مجھے پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ میں لایا تھا۔ اس کا نام پربھا تھا۔ وہ چوتھے فلور کے پرائیویٹ وارڈ کے کمرہ نمبر بارہ میں تھی کمرے کے باہر لگی چٹ پر بھی یہی نام لکھا تھا۔

جب میں ڈاکٹر انل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو پربھا بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"گڈ ایوننگ ڈاکٹر" —— اس نے مسکراتے ہوئے کہا —— "یہ ہیں آپ کے لیکھک دوست جن سے آپ ملوانا چاہتے تھے؟"

"ہاں" —— انل نے اپنی دلکش مسکراہٹ ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں بکھیر دی۔ میرا ذہن ایک سال پہلے کے کونارک مندر کے مین گیٹ پر تصویر کی طرح لگے ایک چہرے کی طرف گھوم گیا۔ ایک سانولا سا پُرکشش چہرہ جس پر اُڑیا کلچر کی بھرپور چھاپ تھی۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں" پربھا نے اچانک ایک جملہ میری طرف پھینکا۔ میں یوں چونکا جیسے کسی نے برف جیسے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا میرے چہرے پر مارا ہو۔

"کچھ نہیں —— کچھ بھی تو نہیں" میں نے اپنی کھیج چھپانے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم اُڑیا لوگ دل کی بات فوراً جان لیتے ہیں" وہ بولی

"خاص طور سے عورتیں" سامنے کھڑے دراز قد، بھرے بھرے جسم والے نوجوان نے کہا۔

تو میرا یہ اندازہ درست تھا کہ پربھا اُڑیسہ کی رہنے والی تھی جہاں کے خوبصورت مندروں کی ایک اپنی خوبصورت تاریخ ہے۔

"آپ پربھا کے ہسبینڈ ہیں۔ اُڑیسہ میں فارسٹ کنزرویٹر" انل بولا۔ جیسے اُس کا تعارف کروا رہا ہو۔

میں جواب میں صرف نمسکار کے لیے ہاتھ ہی جوڑ سکا بول نہیں سکا کچھ بھی۔

اور پربھا نے کہا۔

"میری ماں سے ملیے جس کی پریرنا سے میں جی رہی ہوں ——"

وارڈ میں سامنے پچاس برس کی ایک عورت کھڑی تھی۔ عمر دلکش نہیں تھی لیکن چہرہ دلکش تھا۔ ہلکے سے گورے نقش۔ ہلکے سے کالے بال اور ہلکا سا میک اَپ اور خود بھی ہلکی پھلکی سی۔

"شی ٹریولز لائٹ اِن دی وارڈ" پربھا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور مجھے لگا جیسے کونارک مندر کی کوئی مورتی ہنسی تھی اور اُس کی ہنسی کی آواز مندر کے گنبد میں گونجے جا رہی تھی۔

"میرا مریض دیکھا آپ نے سر؟" انل نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔

"ابھی دیکھ رہے ہیں، شاید سوچ رہے ہیں کہ میں کہاں سے پکڑ میں آسکتی ہوں" پربھا بولی۔

"یہی تو سوچ رہا ہوں پربھا جی۔ اڑیا عورتیں واقعی من کی بات جان لیتی ہیں۔"

میں مسکرایا اور پربھا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سانولے چہرے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر میرا رنگ جو اب کالا ہو گیا ہے۔ کبھی میری ماں کے رنگ کی طرح تھا۔ آپ کو دکھاؤں ایک برس پہلے کی اپنی تصویر؟"

"رنگ کا کالا ہونا تو اس بیماری کا نتیجہ ہے۔ جب گردہ ٹرانسپلانٹ ہو گیا تو رنگ خود بخود ہی صاف ہو جائے گا۔" انل نے جواب دیا۔

"اس کو سمجھاؤ، میرے خاوند کو جو بہت ہی پیارا آدمی ہے۔ لیکن اسے سانولا رنگ پسند نہیں۔" پربھا کے زوردار قہقہے سے اس کا خاوند جیسے گھبرا گیا تھا۔

"یہ تو سٹھیا گئی ہے۔ رنگ کا او بیسیشن ہو گیا ہے اسے۔" پربھا کے خاوند نے تلخی سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر۔ یہ جو تم نے میری بائیں کلائی پر کئی دنوں سے پٹی باندھ رکھی ہے اس کا کیا حشر ہوگا؟ وہی جو دائیں کلائی کا ہوا تھا؟ دیکھتے ہیں یہ کالے کالے داغ جو کبھی زخم تھے اور مندمل ہو کر صرف داغ رہ گئے ہیں۔"

"آرٹریو وینس فسچولا کا تو یہی پروسیس ہے پربھا جی اگر آپ کی آرٹری اور وین دونوں پھول گئیں تو سمجھئے فسچولا تیار ہو گیا اور آپ کی پریشانی ختم۔ ڈائلیسز میں جو تکلیف آپ کو برداشت کرنی پڑتی ہے پھر نہیں ہوگی۔ کم سے کم تین چار سال۔"

تو آپ مجھے تین چار سال اس عذاب میں رکھنا چاہتے ہیں؟" پربھا کی آواز میں بڑا درد تھا۔

"نہیں — صرف اس وقت تک جب تک کہ گردہ ٹرانسپلانٹ نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں چار سال تک یہ تکلیف برداشت کر لونگی مجھ میں خود اعتمادی بہت ہے ورنہ اب تک مر گئی ہوتی۔"

"کچھ دیر لیٹ جاؤ پربھا تھک جاؤ گی۔" اس کی ماں نے پربھا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا کوئی ناول لکھیں گے مجھ پر؟" پربھا نے اپنی ماں کا جواب نہ دیتے ہوئے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

"کس نے کہا آپ سے؟"

"ڈاکٹر نے —" وہ بولی

"لیکن ڈاکٹر تو اگلے ہفتہ اندور جا رہا ہے۔ اس کی بات پر کیسے یقین کیا آپ نے۔"

"اس لیے کہ اس نے دوسرے ڈاکٹروں کی طرح مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔"

"کیا کہا ہے اس نے آپ سے۔"

"کہا ہے کہ گردہ ٹرانسپلانٹ ہونے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال زندہ رہ سکتی ہوں۔"

"سچ —!" میں نے چیخ کر کہا۔

"اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ماں پچاس سال کی عمر میں اپنا گردہ تمہیں دیکر اپنی جان کو سخت خطرے میں ڈال رہی ہے۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے ڈاکٹر انل"

"یہ بھی ٹھیک ہے" میری بات کا جواب انل نے نہیں پرتبھا کی ماں نے دیا اور یہ جواب دیتے ہوئے اس کے گورے چہرے پر زندگی کی شام کا دُھندلکا پھیلنے لگا۔

"تو ٹھیک کیا نہیں ہے کون بتائے گا مجھے؟"

"یہ کوئی بھی نہیں بتا پائے گا میرے لیکھک دوست! یہ تمہیں خود ہی جاننا ہوگا اور اس راز کو پانا ہوگا۔ اور یہ راز تم جب ہی جان پاؤ گے جب تمہارا اپنا رینل فیلیور ہوگا۔ اور تمہارا فیسچولا تیار ہونے میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔ اور تم تڑپو گے اور کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ تمہیں صرف ہمدردی ملے گی، درد بانٹنے والا کوئی نہیں ملے گا" پرتبھا نے زوردار قہقہہ لگایا اور پھر آہستہ سے بستر پر لیٹ گئی اور تکیے پر رکھے اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔

میں ڈاکٹر انل کو وارڈ میں ہی چھوڑ کر باہر آ گیا۔ جب ہم وارڈ میں داخل ہوئے تھے تب روشنی تھی اور اب ہلکا ہلکا اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پرتبھا اور اس کی ماں ایسے دو مسافر ہیں جن کے سامنے کوئی منزل نہیں۔ کوئی روشنی نہیں کوئی چاند نہیں۔ صرف لحہ لحہ گہرا ہوتا اندھیرا ہے جو ایک ہی بار رات کے گہرے سمندر میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے اپنا وجود ختم کر دے گا اور اسی وقت ساحل سے روشنی کی کوئی کرن ناچ اُٹھے گی۔ جیسے کونارک کے مندر کے باہر تصویر کی طرح لگی اُڑیا لڑکی کے چہرے پر کسی دیکھنے والے کی گہری نگاہ ——!

○○○

ایک گونگی لڑکی

سِکم سے آئی ہوئی وہ تین لڑکیاں تھیں۔

ڈوما پازو

لیلا تین زنگ

درگا گورنگ

ان لڑکیوں کا گروپ بہت جاندار تھا۔ وہ ہاسٹل کے ایک کمرے میں رہتی تھیں اور کبھی الگ نہ ہوتی تھیں۔ سدا خوش، بے باک اور ہنس مکھ اور حسین عورتیں۔ ڈوما پازو لاپاچہ تھی۔ لیلا تین زنگ بھٹیہ اور درگا نیپالی۔ سکم کی آبادی کے مختلف تین بڑے طبقوں کی نمائندگی کرنے والی ان لڑکیوں کے خدوخال پر اپنے اپنے مخصوص طبقوں کی چھاپ تھی۔ ڈوما پازو پتلی سی چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں والی لڑکی تھی جس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ناک قدرے چپٹی تھی۔ لیکن رنگ بالکل صاف تھا اور قد چھوٹا تھا۔ لیلا تین زنگ لمبے قد کی بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی جس کی آنکھیں بھی چھوٹی نہیں تھیں اور ناک بھی چپٹی نہ تھی۔ رنگ بہت ہی گورا تھا۔ درگا گورنگ چھریرے سے اکہرے بدن کی لڑکی تھی جس کا رنگ گندمی تھا اور خدوخال پر جو چھاپ تھی اس سے تو وہ دِلّی یا اس کے نزدیک اتر پردیش یا ہریانہ کی رہنے والی لگتی تھی۔ کئی اور علاقوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ بہار سے، اڑیسہ سے، تامل ناڈو سے، مہاراشٹر اور گجرات سے اور دِلّی سے بھی۔

رمیش دہلی سے آیا تھا۔

اور ان سب لوگوں کو یہاں دس دن رکنا تھا اور اپنے اپنے علاقوں میں رہنے والی عورتوں کی پرابلمز پر سیدھی سادی زبان میں اُن کے استعمال کے لئے اپنے اپنے علاقے میں بولی جاتی ہوئی زبان میں اُنہی کے مسئلوں کی بنیاد پر عام فہم ادب کی تخلیق کرنا تھا۔ اس قسم کی ورکشاپوں میں رمیش پہلے بھی کئی بار شرکت کر چکا تھا اور ابھی حال ہی میں اسے اپنی ایسی ہی ایک کتاب پر قومی ایوارڈ بھی ملا تھا جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا۔

پہلے دن ورکشاپ کے افتتاح کے بعد ادیبوں نے اُسے اس قومی ایوارڈ پر مبارکباد دی اور دو ایک ادیبوں

نے جو اسے پہلے سے جانتے تھے اس کا تعارف دوسرے ادیبوں سے بھی کرایا۔ رمیش اتفاقاً ایک ہی دن میں اپنے اس چھوٹے سے گروپ کے ہر ایک ادیب سے متعارف ہو گیا۔ لیکن اس گروپ میں بھی علاقائی زبانوں کا مسئلہ پیش آ گیا اور آپس میں کمیونیکیشن گیپ محسوس ہونے لگا۔ جو لوگ انگریزی بول لیتے تھے وہ تو ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگے لیکن کچھ ایسے ادیب بھی تھے جنہیں ایک دوسرے سے ذہنی رشتہ قائم کرنے میں دقّت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور تو بھی ادیب آپس میں بات چیت کر کے اپنے درمیان کا فاصلہ کم کرنے لگے لیکن سکم سے آئی ہوئی تینوں لڑکیاں اپنا ایک الگ تھلگ جزیرہ بنا کر اس میں قید ہو گئیں۔ اور شروع شروع کے دو دنوں میں وہ اپنے اس خود ساختہ جزیرے میں ہی قید رہیں۔

تیسرے دن ورکشاپ کے منتظمین نے غالباً اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے بزرگ لیڈر کو تقریر کرنے کے لئے بلا لیا جو اتفاق سے ادیب بھی تھے لیکن جن کی ادبی خدمات کے بارے میں سوائے منتظمین کے کسی کو بھی کوئی واقفیت نہ تھی اور جب منتظمین نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ وہ صاحب دراصل ایک بہت ہی اونچے ادیب تھے اور اتفاق سے لیڈر بن گئے تھے تو گروپ کے کسی بھی فرد کو اس کا یقین نہ آیا بلکہ کچھ نئے ادیب تو مہمان خصوصی کے تعارف پر اس طرح مسکرائے جیسے وہ کہہ رہے تھے کہ دراصل تو وہ صاحب سوفی صدی لیڈر تھے اور کہیں اپنے نام سے کسی اخبار میں ایک آدھ آرٹیکل چھپ جانے کے کارن ادیب اور صحافی بھی بن گئے تھے اور انہی نئے ادیبوں میں سے ایک ادیب نے جب مہمان خصوصی کی نہایت ہی بے ہودہ سی سیاسی تقریر کے بعد اُن سے کہا کہ وہ نئی نظم اور نئی کہانی کی تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں تو معاملہ بالکل بگڑ گیا۔ ان بے چاروں کو تو نئی نظم اور نئی کہانی کی ترکیب بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ نئی نظم اور نئی کہانی پر وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں نئے انسان کی بات کرنی چاہیئے۔"

"یہ نیا انسان کیا چیز ہے صاحب؟" ایک ادیب نے سوال کیا۔

"جس طرح نئے بچے، نئی کھاد، اور لیبارٹری میں کئے جانے والے نئے تجربے ہوتے ہیں۔ اور کیا ہے نیا انسان۔"

ایک دوسرے ادیب ہی نے جواب دیا تھا۔

جواب میں چبھتے ہوئے طنز کی تیکھی لہر سارے ہال میں پھیل گئی اور سارا ہال دیر تک قہقہوں سے گونجتا رہا۔ ان تینوں سکمی لڑکیوں کے بلند اور مترنم قہقہے سب سے آخر تک گونجتے رہے۔ صدر نے جب میز پر دو تین بار زور سے ہاتھ مارے تو قہقہوں کی مترنم گونج اس بھاری اور کرخت آواز کے بوجھ کے نیچے دب کر خاموش ہو گئی۔

"آپ کا کیا خیال ہے، کسی ادیب کو کومٹڈ ہونا چاہیئے یا نہیں؟" یہ سوال رمیش نے کیا۔

مہمان خصوصی شاید انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے صدر سے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لئے اپنے کان ان کے چہرے کے قریب کر دئے۔

لیکن وہ شاید اس سوال کا مطلب صاف طور سے نہ سمجھ سکے تھے۔ مگر جواب انہوں نے دیا اور کہا۔

"میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ ادیب کو کسی بھید بھاؤ سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اسے صرف لکھنا چاہیئے۔"
ایک دوسرا قہقہہ گونجا اور اس گونج میں گھلتا ہوا ایک جملہ جانے کیسے اُبھر آیا۔
"کومٹڈ ہونے کا مطلب بھید بھاؤ کرنا تو نہیں ہوتا حضور۔"
"ہوتا ہے۔" کہیں نکڑ سے ایک آواز اُبھری
ایک اور قہقہہ گونجا اور اسی قہقہے کو دباتے ہوئے مہمان خصوصی نے بولنے والے کیطرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
"میں ان جن سے متفق ہوں۔"
ایک اور بہت ہی بلند قہقہہ گونجا جسکی آواز کی آخری گونج سکم سے آئی ہوئی تینوں لڑکیوں کے مترنم قہقہے میں دیر تک گھلتی رہی۔ پھر مہمانِ خصوصی چلے گئے اور سبھی کے سبھی منتظمین انہیں باہر کار تک چھوڑنے گئے اور ہال میں سوائے ادیبوں کے اور ان قہقہوں کے اور ان کے تیکھے جملوں کے کچھ نہیں تھا۔
اُسی شام سکم سے آئی ہوئی تینوں ادیب لڑکیوں سے رمیش کی پہلی غیر رسمی ملاقات ہوئی۔ شاید انہوں نے بھی اپنے خود ساختہ جزیرے سے باہر نکل آنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ تمام گفتگو انگریزی میں ہی ہوئی تھی کہیں ایک آدھ لفظ اُردو یا ہندی یا ہندوستانی میں بھی بولا گیا۔ دس پندرہ منٹ کی اس آپسی گفتگو میں ڈوما پازو اور لیلا تمین زنگ نے ہی حصہ لیا۔ درگا گورنگ تو بس بیچ بیچ میں اپنی معصوم سی شرمیلی مسکراہٹ سے گفتگو کی خالی جگہیں پُر کرتی رہی جیسے چھوٹی جماعتوں کے بچے املا کی پریکٹس کرتے ہوئے کاغذ پر لکھی ہوئی سطروں میں خالی جگہیں بھرتے ہیں چوگیال سے لیکر بُدھ کے آٹھ کے سامنے ہمز پڑھنے تک سبھی موضوعات پر بات ہوتی رہی اور درگا گورنگ اپنی مسکراہٹ سے خالی جگہیں پُر کرتی رہی۔
"سُنا ہے چنڈی گڑھ بہت اچھا شہر ہے۔" ڈوما پازو نے کہا۔
"اے بیوٹی فُل سٹی۔" رمیش نے جواب دیا۔
"ہمارے ایک فیملی فرینڈ ہیں وہاں، کبھی آؤں گی ضرور اُدھر۔"
"میں بھی آؤں گی۔" لیلا تمین زنگ بولی
"اور آپ۔" رمیش نے درگا گورنگ سے سوال کیا۔
وہ اپنی عادت کے مطابق مسکرائی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی
"لگتا ہے آپ کی تھرڈ پارٹنر گونگی ہے۔"
"نہیں یہ بہت اچھی نظمیں لکھتی ہے۔" ڈوما پازو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"لیکن بولتی تو نہیں۔" رمیش نے یہ سوال ڈوما پازو سے کرنے کے بعد جواب کی توقع پر دُرگا کی طرف دیکھا۔
وہ پھر مسکرا دی۔
"باؤ اِلو سینٹلی شی سمائلز!" وہ بولا

"یس" لیلا تین زنگ نے کہا۔

"آپ کیا لکھتی ہیں"

"میں نیپال کی لوک کتھاؤں پر کام کر رہی ہوں" لیلا تین زنگ بولی۔

"اور آپ"

"آئی رائٹ فار دی چلڈرن" ڈوما پازو نے جواب دیا۔

"گڈ۔ ہمارے بچوں کے لئے اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا" وہ بولا۔ وہ تینوں لڑکیاں ہنسنے لگیں اور اُسے لگا جیسے وہ بے مقصد کی بے لوث اور پُر اسرار ہنسی دھوپی کے پیڑ کی ان سوکھی پتیوں کو بُدھ کے آگے کے سامنے پوجا کے وقت جلنے والی دُھواں بھری خوشبو کی طرح تھی جو تمام ماحول کو معطر اور پوتر کر دیتی ہے۔

"ڈوما کے کیا معنی ہیں" اس نے پوچھا۔

"دیوی"

ڈوما پازو جواب دینے کے ساتھ ہی ساتھ ہنسی اور دونوں دوسری لڑکیاں ایک بار پھر اس کی ہنسی میں شامل ہو گئیں اور رمیش ان کی اس ہنسی سے بے حد متاثر ہوا۔ اُسے لگا شاید ایسی ہی مترنم آواز پراچین کال میں بڑے بڑے مندروں میں ناچتی ہوئی دیو داسیوں کے گھنگھروں سے نکلا کرتی تھی۔ مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگوں میں، جنہیں کئی روز تک ایک ہی جگہ اکٹھے کام کرنا ہو اور اکٹھے رہنا ہو نئے نئے انسانی رشتے جڑتے ہیں جو کچھ دیر تک مُبہم سی شکلیں اختیار کرنے کے بعد واضح رنگ روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور دو دو تین تین لوگوں کے بنتے بگڑتے رشتے آخر کچھ واضح تعلقات میں بدل گئے اور چھوٹے چھوٹے سے گروپ بن گئے۔ سب سے بڑا گروپ وہ تھا۔ جس میں ڈوما پازو، لیلا تین زنگ، درگا گورنگ اور رمیش تھا۔

وہ جگہ جہاں اس طرح کے عارضی انسانی رشتے جُڑے تھے، لکھنؤ سے باہر ایک عالیشان عمارت تھی جس کے گنبدوں پر اب بھی نواب آصف الدولہ کی وجاہت کے مٹتے ہوئے نشان باقی تھے۔ رمیش اپنے اس گروپ کے ساتھ حضرت گنج، امین آباد، بڑے امام باڑے، بھول بھلیاں، چھوٹے امام باڑے، میوزیم، ریذی ڈینسی اور گومتی کے تٹ پر گیا۔ انہیں کافی ہاؤس میں کافی پلائی۔ مختلف سنیما ہاؤسوں میں فلمیں دکھائیں۔ اچھے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھلایا۔ اور شام کی تنہائیوں میں ڈوما پازو سے نیپالی لوک گیت بھی سنے۔ ایک لوک گیت کے بول وہ کئی روز تک گنگناتا رہا۔ اس کا لہجہ ان جیسا نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ان کی زبان میں ہی اس گیت کے بول دہراتا رہا۔ لیکن درگا نے ہاں اور نہ کے علاوہ کچھ نہ بولا۔ بہت اصرار پر بھی اس نے اپنی کوئی نظم نہ سنائی۔ ایک دن بھول بھلیوں میں گائیڈ کی مدد سے گھومتے ہوئے ایک جگہ رُک کر رمیش نے دُرگا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکی کے بارے میں میرا ایک اندازہ ہے"

"کیا" گوری چٹی لیلا تین زنگ نے پوچھا۔

"یہ لڑکی صرف دو حالتوں میں کھل کر بات کر سکتی ہے۔"
"کن حالتوں میں۔"
گفتگو کے دوران درگا کی نظریں رمیش پر جمی رہیں اور وہ مسکراتی رہی۔
وہی روز کی بے لوث اور معصوم مسکراہٹ۔
"جب اُسے کوئی بہت بڑا صدمہ ہوگا یا جب اُسے بے انتہا مسرت سے دوچار ہونا پڑے گا۔"
رمیش نے دیکھا درگا کی گہری آنکھوں نے جو اس پر جمی تھیں پلکیں جھپکنا بند کر دی تھیں اور وہ اسے ایک ٹک گھور رہی تھی اور پہلے سے زیادہ کھل کر مسکرا رہی تھی اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ مر گئی اور اس کی کھلی گہری آنکھیں مندنے لگیں اور ان کے کونوں سے نیم گرم آنسو رسنے لگے اور وہ ڈوما پا زو کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ بھول بھلیوں کے اندھیرے میں گائیڈ آگے نکل کر کہہ رہا تھا۔ ان جھروکوں سے بیگمات نیچے کے بڑے ہال میں جمع لوگوں کو دیکھا کرتی تھیں۔
اسی لمحہ ڈوما نے رمیش سے کہا۔
"یو ہیو ہرٹ ہر۔"
"آئی ایم سوری۔" اس نے جواب دیا۔
پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ چاروں بھول بھلیوں کے نیم اندھیرے رستوں میں گردش کرتے رہے اور گائیڈ اپنے روز روز کے دہرائے ہوئے جملوں کو بغیر کسی غلطی کے دہراتا رہا اور پھر وہ سیڑھیاں اُتر کے نیچے آگئے اور گائیڈ نے جھک کر سلام کیا۔ رمیش نے اُسے پتلون کی جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا اور بڑے امام باڑے کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ اسے یہ علوم نہیں تھا کہ وہ تینوں لڑکیاں اپنے اپنے کپڑوں پر جمی گرد کو جھاڑ کر سستانے کے لئے وہیں امام باڑے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ گیٹ پر کچھ دیر کھڑا رہا لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور پھر وہ تینوں لڑکیاں چپ چاپ اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔
"شی از اے ویری سینسی ٹو گرل۔" لیلا تین زنگ نے کہا۔
"آئی نو۔" اس نے کہا لیکن درگا گورنگ کی طرف دیکھا نہیں۔
وہ رات رمیش کے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ اب ورک شاپ کے سات دن گذر چکے تھے۔ صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ باقی سبھی ادیبوں نے اپنا اپنا کام کافی حد تک پورا کر لیا تھا لیکن اس نے ابھی تک شروع بھی نہ کیا تھا۔ آج صبح اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج کہیں نہیں جائے گا اور اپنا کام کرے گا۔ اتوار کے دن سبھی لوگ اپنے اپنے گروپوں میں بٹ کر سائیٹ سیئنگ کے لیے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور وہ اپنی میز پر کاغذ سجا کر آج جٹ کر کام کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ڈوما آگئی۔
"آپ تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟"

"آج میں دیر سے نہاؤں گا۔ ناشتہ میں نے کر لیا ہے۔"

"اکیلے میں"

"ہاں"

"یو ڈو ناٹ ڈیزرو دیٹ فار اس"

"آج میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا۔"

"آپ ہمیں سائٹ سینگ کے لئے نہیں لے جائیں گے۔ ہم نے صرف آپ کی خاطر سب کو نظر انداز کر دیا۔ یو آر لیٹنگ اس ڈاؤن رمیش صاحب۔"

"یو کین جوائین سم اَدر گروپ"

"ہمیں معلوم نہیں تھا آپ اس طرح بھی کر سکتے ہیں"

پیشتر اس کے کہ وہ ڈوما کی کسی بات کا جواب دیتا اور کوئی اُلٹی سُلٹی بات کہہ ڈالتا درگا گورنگ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی معصوم مسکراہٹ تھی۔ بے زبان، خاموش اور ساکن مسکراہٹ جو شاید کبھی بولتی بھی ہے۔ وہ اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا۔

"میں ابھی تیار ہو جاتا ہوں۔ تم لوگ اپنے کمرے میں چلو۔"

اس نے دیکھا درگا گورنگ کی مسکراہٹ کتنی اُجلی اور وسیع اور پیاری اور سندر ہو گئی تھی جیسے ہر طرف سفید خشک چاندنی پھیل گئی ہو۔ اور وہ ان کے ساتھ چلا گیا تھا اور دن بھر گھومتا رہا تھا اور جب شام کو لوٹا تھا تو بے حد پریشان تھا۔ اس کا آج کا دن بھی ضائع ہو گیا تھا اور اس نے دُرگا کو بھی ناراض کر لیا تھا۔

ان سات دنوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ سکم سے آئی ہوئی یہ تینوں نئی لکھنے والیاں بہت اچھی تھیں اور بڑی لگن سے اپنا کام کرتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ان سب میں دلچسپی لینے لگا تھا لیکن اُسے ان دنوں میں ایک بار بھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ان تینوں لڑکیوں میں سے کونسی لڑکی کو اس میں دلچسپی تھی۔ درگا گورنگ کو تو قطعی کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ تو بات کرتی ہی نہ تھی صرف مسکراتی تھی ڈوما پازو اور لیلا تین زنگ دونوں میں سے کس کو اس میں دلچسپی تھی یہ وہ بالکل نہ جان سکا۔ اُن کی باتیں اُن کا برتاؤ، ان کا کھلاپن اتنا یکساں تھا کہ اُسے کچھ بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ ہاں ایک بات ضرور تھی کہ جب ڈوما اس سے ملنے آتی تھی تو لیلا تین زنگ فوراً آ پہونچتی تھی اور جب لیلا اس سے ملنے کا موقع نکالتی تھی تو ڈوما آ جاتی تھی۔ اس لئے ایسا موقع آیا ہی نہیں تھا جب وہ اکیلے میں ان میں سے کسی سے بات کر پاتا۔ ڈوما اور لیلا میں کوئی آپسی سمجھوتہ تھا یا آپسی رقابت تھی۔ اس کے بارے میں رمیش کچھ بھی نہ جان سکا۔ لیکن وہ ہلکے گندمی رنگ کی، ہر لمحہ مسکراہٹ کی کرنیں بکھیرتی ہوئی لڑکی تو جیسے اپنی کوئی شخصیت ہی نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی شخصیت کی چھاپ کسی لمحہ، کسی جگہ یا کسی آدمی پر لگائے۔ شخصیت کی اس حد تک کی بے نیازی رمیش کے لئے اور بھی تکلیف دہ بن گئی تھی۔

رمیش نے دو راتیں جاگ کر اپنا کام مکمل کر لیا جو اس کے اپنے معیار کے مطابق نہیں تھا۔ اس نے اسے ایڈٹ کرنے

کے لئے واپس لے لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ چنڈی گڑھ پہونچ کر ہفتہ بھر میں ڈاک سے اپنا مسودہ بھجوا دیگا۔ منتظمین کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

آج ورک شاپ کا آخری دن تھا۔

سبھی لوگ رات کی گاڑی سے جا رہے تھے

رمیش ایک دن کیلئے رُک گیا تھا کہ وہ اپنے لوکل ادیب دوستوں سے بھی مل لے جنہیں وہ ان دس دنوں میں ایک بار بھی نہ مل سکا تھا۔

ایک نارمل سا فیرویل تھا۔

سبھی ادیبوں کو اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ سب نے مختصر الفاظ میں ورکشاپ کے منتظمین کی تعریف کی تھی۔ اور اپنی علاقائی زبان میں اپنی کوئی چھوٹی موٹی تخلیق بھی سنائی تھی۔ سکم کی تینوں لڑکیوں نے اپنا وہی لوک گیت سنایا تھا جو ڈوما نے ایکدن رمیش کو سنایا تھا اور جس کے بول وہ کئی دنوں تک گنگنا تا رہا تھا۔ جب وہ تینوں لڑکیاں لوک گیت سنا رہی تھیں تو رمیش آج بھی اپنی پسندیدہ سطریں دھیرے دھیرے زیر لب دہرا رہا تھا جیسے وہ خود اپنے آپ کو سُنا رہا ہو۔

ڈوما پازو، لیلا تین زنگ اور درگا گورنگ کی سِلی گُڈی جانے والی ٹرین رات کو ساڑھے بارہ بجے چھوٹتی تھی وہاں سے وہ اگلے دن ٹیکسی سے گنگٹوک پہونچ جائیں گی جو ان کا وطن تھا اور جس کی مٹی میں کھیل کر وہ جوان ہوئی تھیں اور جہاں لوگ ان کی تخلیقات میں بولتے تھے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات سے ان گونگے اَن پڑھ، کمزور اور مجبور لوگوں کی زبان دی تھی اور ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے بچّوں کے خوبصورت مستقبل کے لئے جد وجہد کریں اور مجبوری اور حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف لڑیں۔ کشمکش میں ہی تو زندگی ہے۔

رمیش رات کو انہیں اسٹیشن پر سی اوف کرنے کے لئے گیا۔ رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔

ڈوما پازو اور لیلا تین زنگ نے اسے گنگٹوک آنے کی دعوت دی۔ اس نے بھی انہیں چنڈی گڑھ آنے کو کہا۔ اس تمام گفتگو کے دوران درگا گورنگ اپنی ہلکی ہلکی مسکراہٹ کی کرنیں مختلف زاویوں سے پھینکتی رہی لیکن بولی کچھ نہیں۔ اور پھر وہ تینوں گاڑی کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئیں اور رمیش کھڑکی کے ساتھ کھڑا ان سے باتیں کرتا رہا۔

ڈوما نے پوچھا۔

"کیا کومینٹ کیا تھا آپ نے درگا کے بارے میں ؟"

"اب نہیں کہوں گا کچھ"

گفتگو رُک گئی۔ جب بہتے ہوئے پانی کے سامنے کوئی چٹان آجائے تو وہ رُک جاتا ہے۔ اسی طرح بات میں کوئی رکاوٹ آجائے تو گفتگو بھی رُک جاتی ہے۔ اور پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے دیکھا درگا اپنی مخصوص مسکراہٹ سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے تک آگئی۔ رمیش اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ اسی طرح مسکرا رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی اس سے وہی کیفیت تھی جو ابھی کچھ ہی دن پہلے

بڑے امام باڑے کی نیم اندھیری بُھول بھلیوں میں اس نے دیکھی تھی۔ وہ اس کے اور قریب آ گیا۔
"دُرگا"
"جی" اور اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اس نے اپنے پرس میں سے نکال کر جلدی سے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اُسی سمے ٹرین اسٹارٹ ہوگئی اور وہ ڈوماپاڑ وا ورلیلاتین زنگ کو ٹھیک سے الوداع بھی نہ کہہ سکا۔ دُرگا کچھ دیر دروازے پر کھڑی رمیش کو دیکھتی رہی۔
ٹرین کے جانے کے بعد رمیش نے لفافہ کھولا۔ بڑا ہی مختصر سا خط تھا اس کے لئے۔ خط انگریزی میں تھا۔

رمیش صاحب!

آپ نے کچھ روز پہلے میری شخصیت کا جو تجزیہ کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ میں واقعی گونگی ہوں اور زبان بس ابھی ابھی ملی ہے مجھے۔ ابھی کچھ لمحے پہلے میری یہ فرینڈز بھی جو میرے ساتھ ہیں نہیں جانتیں کہ پندرہ روز کے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ یکم کے ایک نوجوان ادیب کے ساتھ جو آپ ہی کی طرح باتیں کرتا ہے۔ کیا آپ میری شادی میں نہیں آئیں گے؟ میں جاتے ہی آپ کو دعوت نامہ بھجواؤں گی۔

آپکی!
ایک گونگی لڑکی

رمیش کو لگا جیسے اس گونگی لڑکی کو اب ہمیشہ کے لئے زبان مل چکی تھی۔

چنار چنار چہرے

اس بار میں علی محمد زرگر کے پاس ہی ٹھہرا تھا۔

علی محمد زرگر، سری پرتاپ ہائی اسکول سری نگر، میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ مجھے ڈھونڈ نکالنے میں بھی اُسی کی بھرپور کوشش شامل تھی۔ زرگر سری نگر میں ایک اُردو ویکلی کا ایڈیٹر تھا۔ اس لیے ادبی حلقوں میں اُس کا آنا جانا رہتا تھا۔ اخبار کی ایڈیٹری تو محض ایک شغل تھا ورنہ وہ ایک شال مرچنٹ تھا اور اس کاروبار میں اُس نے خاصا روپیہ کمایا تھا۔ پہلے وہ سری نگر کے اندرونی حصے زینہ کدل میں رہتا تھا۔ لیکن اب کئی برسوں سے اُس نے ریذیڈینسی روڈ پر اپنا ایک خوبصورت دو منزلہ مکان بنوالیا تھا۔ اُس کے خاندان کے کچھ لوگ ابھی تک زینہ کدل ہی میں رہ رہے تھے۔

مجھے ایک ادبی مجلس میں اپنا ایک افسانہ پڑھنا تھا۔ سننے والوں میں علی محمد زرگر بھی تھا۔ جب یہ ادبی تقریب ختم ہو گئی تو وہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"آپ پرتاپ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے؟"

"جی ہاں"

"اسکول کے گیٹ کے سامنے سے سیڑھیاں چڑھ کر، اُوپر والی منزل کی بائیں طرف کے پہلے کلاس روم میں، بائیں طرف کے پہلے ڈیسک پر آپ اُس سائڈ پر بیٹھا کرتے تھے، جہاں کمرے کی کھڑکی تھی"

"جی ہاں۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھنا اچھا لگتا تھا"

"آپ کے ساتھ ایک لڑکا علی محمد بھی بیٹھا کرتا تھا"

اس کی بات سُن کر میں نے اپنے ذہن پر دباؤ ڈالا اور پھر پل بھر کے بعد بولا۔

"آٹھویں جماعت میں، میرے ساتھ ڈیسک پر ایک دُبلا پتلا، گورا سا لڑکا بیٹھا کرتا تھا۔ جو ہر وقت اپنے فرن کے کونے سے اپنی ناک پونچھتا رہتا تھا"

"وہ لڑکا اب کافی عمر کا ہو گیا ہے لیکن اُس کی ناک پونچھنے کی عادت ابھی تک نہیں چھوٹی۔ اب وہ گھٹیا سے فرن کی جگہ قیمتی شال استعمال کرتا ہے،" وہ ہنسا۔

"آپ جانتے ہیں علی محمد کو؟"

"اب وہ علی محمد زرگر ہے اور اُس نے ناک پونچھنے کے لئے آپ کو ایک شال بھیجی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ ایک نہایت ہی قیمتی شال دونوں ہاتھوں پر پھیلائے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"علی محمد کہاں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ بھی حاضر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے پاس کھڑے آدمی سے شال لے کر میرے کندھوں پر ڈال دیا اور پھر مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور بولا "تم بہت حُسن پرست تھے۔ شاید اِسی لیے مجھے اپنا دوست سمجھتے ہوئے بھی مجھے فرن سے ناک پونچھنے پر ٹوکا کرتے تھے۔"

"حُسن پرست تو میں اب بھی ہوں۔"

"یہ تو تمہارے افسانوں سے ظاہر ہے۔" اُس نے 'آپ' کا تکلف چھوڑ دیا تھا اور اپنے پُرانے یار کو اپنی شفاف ہنسی کی بوچھاڑ میں نہلا رہا تھا۔

علی محمد زرگر کی عمر بھی پچپن کے قریب تھی۔ میری عُمر کے برابر۔

"یار تم تو بڑے ینگ لگتے ہو۔"

"تم بھی تو خاصے اسمارٹ ہو۔ دراصل یہ ہماری وادی کی برکت ہے۔ کشمیر کی حسین وادی اپنی طرح سب کو خوبصورت اور جوان رکھنا چاہتی ہے۔"

اُس شام علی محمد زرگر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے ملوایا اور رات کو بڑا ہی پرتکلف کھانا کھلا کر مجھے میرے ہوٹل چھوڑ گیا۔

ایک دن کے بعد جب مجھے واپس آنا تھا تو وہ مجھے ایرپورٹ چھوڑنے آیا اور مجھ سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ آئندہ جب کبھی سری نگر آؤں گا، اُسی کے پاس ٹھہروں گا۔

اِس لیے اِس بار میں علی محمد زرگر کے پاس ہی ٹھہرا تھا۔

ناشتے کے دوران اُس نے پوچھا۔

"آج کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"آج میں کچھ ایسی جگہیں اور عمارتیں دیکھنا چاہتا ہوں، جن سے میرا ماضی وابستہ ہے۔"

"جگہیں کل دیکھنا میرے ساتھ۔ آج صرف عمارتیں دیکھو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کون کون سی عمارتیں دیکھنا چاہتے ہو؟"
"کئی ہیں۔ دن بھر گھومتا رہوں گا۔"
"اپنا اسکول ضرور دیکھنا۔"
"سب سے آخر میں اسکول ہی دیکھوں گا۔"
"سب سے پہلے کیوں نہیں؟"
"اس لیے کہ کلائمکس زوردار ہونا چاہیے۔"
"یہ بھی تمہاری افسانوی ٹیکنیک ہے۔"
"یہی سمجھ لو۔"
"تو اس طرح کرو۔ دوپہر کا کھانا گھر پر ہی کھاؤ۔ تھوڑی دیر آرام کرو اور پھر گلشن کو ساتھ لے جاؤ اپنا اسکول دیکھنے۔"
"اس بے چاری کو کیوں اس جھنجھٹ میں ڈالتے ہو؟"
"گلشن کا اصرار ہے کہ وہ اس اسکول کو ضرور دیکھے گی، جہاں تم اور میں پڑھتے رہے ہیں۔"
"تو ٹھیک ہے۔"
علی محمد نے گلشن کو آواز دی۔ گلشن کمرے میں آئی تو علی محمد نے کہا۔
"تم انکل کو لے جانا ہری پرتاپ ہائی سکول میں قریب ہی تو ہے۔
معلوم ہے نا تمہیں راستہ؟"
"وِمن کالج کے پاس ہی تو ہے ابا جان۔"
"ہاں وہی ہے۔ انکل دوپہر تک لوٹ آئیں گے۔"
"میں بھی تب تک اسکول سے آجاؤں گی۔"
گلشن اسی سال آٹھویں جماعت میں آئی ہے۔ بڑی پیاری اور معصوم لڑکی ہے۔ اس کا باپ بھی آٹھویں جماعت میں ہی میرا کلاس فیلو تھا اور بے حد پیارا اور معصوم تھا۔
"تمہارا باپ بھی اتنا ہی پیارا اور معصوم ہوا کرتا تھا جتنی کہ تم ہو۔"
"وہ تو اب بھی بہت پیارے ہیں۔" گلشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تمہاری ممی کا کیا خیال ہے؟"
"اس کا بھی یہی خیال ہے۔"
"ذرا پوچھ کر آؤ ممی سے۔"
میری بات سن کر گلشن نہایت معصومیت سے چلی گئی کمرے سے باہر۔ شاید اپنی ممی سے اپنے ابا کے بارے میں پوچھنے کے لیے۔

علی محمد اور میں دیر تک ہنستے رہے۔

دوپہر کو میں ریذیڈنسی روڈ، جہلم کا بنڈ، ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ، شیر گڑھی، گاؤکدل اور مہاراج گنج کے علاقوں میں گھومنے کے بعد واپس آگیا۔ ستمبر کے مہینے میں بھی سری نگر میں خاصی گرمی تھی۔ دن میں پنکھا چلانا پڑتا تھا۔ علی محمد مجھ سے پہلے گھر پہونچ چکا تھا۔ گلشن ابھی ابھی اسکول سے لوٹی تھی۔ گرمی سے اُس کا گورا چہرا تپ رہا تھا۔

لنچ کے بعد میں اخبار پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ سری نگر میں اخبار صبح نہیں، دوپہر کو آتے ہیں کیوں کہ دہلی سے ہوائی جہاز دوپہر کے بعد آتا ہے۔ علی محمد اپنی دکان پر چلا گیا۔ کچھ فارن کسٹمرز آرہے تھے۔

میری نیند اچانک ٹوٹ گئی۔

گلشن کہہ رہی تھی۔

"انکل ساڑھے پانچ بج رہے ہیں"

"سوری، بیٹی"

"چائے لاؤں؟"

"لے آؤ"

"اسکول دیکھنے چلیں گے نا؟"

"ضرور چلیں گے"

گلشن بہت خوش تھی۔

چائے لے کر آئی تو کہنے لگی۔

"انکل آپ کے زمانے میں تو لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے نہیں پڑھتے تھے؟"

"نہیں بیٹی"

"لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکول الگ الگ ہوتے تھے؟"

"الگ بھی ہوتے تھے اور اُن کی تعداد بھی کم ہوتی تھی۔ بہت لڑکیاں بھی اسکولوں میں نہیں جاتی تھیں"

"لڑکوں اور لڑکیوں کے جھگڑے بھی تو نہیں ہوتے ہوں گے، اُن دِنوں؟"

"نہیں — اب جھگڑے ہوتے ہیں کیا؟"

"بہت ہوتے ہیں انکل" یہ جواب دیتے ہوئے گلشن کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "لڑکے بڑے فضول ہوتے ہیں انکل"

"بڑے ہی فضول ہوتے ہیں بیٹی — اِسی لیے تو بڑے ہوکر یا وہ کہانیاں لکھتے ہیں یا شال بناتے ہیں"

میں زور سے ہنسا اور پھر میری دِکھاوے کی ہنسی میں گلشن کی خلوص بھری اور ایماندار اور معصوم ہنسی بھی شامل ہوگئی۔ لگا جیسے ایک بھرا پُرا باغ مہک اُٹھا تھا۔

گلشن مجھے سری پرتاپ ہائی اسکول کی طرف لے جارہی تھی۔ ریذیڈنسی روڈ سے دُور نہیں تھا اسکول۔ ہم پیدل

ہی جا رہے تھے۔ وومن کالج کی بلڈنگ سے گذر کر ذرا آگے بائیں ہاتھ کو؛ ایک کھلی سی گلی کی طرف مڑتے ہوئے گلشن نے کہا۔

"یہ گلی جاتی ہے آپ کے اسکول کو، انکل۔"

"لیکن یہاں تو بڑی کھلی اور سیدھی سڑک ہوتی تھی، جو ٹھیک سری پرتاپ کالج کے گیٹ پر نکلتی تھی۔"

"آپ کے زمانے کی بات ہوگی وہ۔ ہم نے تو بس یہ گلی ہی دیکھی ہے۔"

"ہمارے وقت کی سڑکیں گلیوں میں بدل گئی ہیں اور گلیاں بازاروں اور سڑکوں میں۔"

"اور لوگ انکل؟"

"وہ یا تو کھنڈر بن گئے ہیں یا ٹھو کھے ہوئے چنار۔"

"لیکن آپ کے اسکول میں تو اب بھی بڑے بڑے سایہ دار چنار موجود ہیں۔"

اور پھر گلشن مجھے اُس گلی نما سڑک سے پیدل چلاتے ہوئے، میرے اسکول کے چھوٹے سے گیٹ کے سامنے لے آئی۔

"یہ رہا آپ کا اور ابا کا اسکول!"

یہ چھوٹا سا گیٹ تو کبھی تھا ہی نہیں۔ اور یہ نئے بنے دو چھوٹے چھوٹے ونگ بھی نہیں تھے۔ ان نئے ونگوں کے پیچھے اسکول کی مٹ میلے رنگ کی دومنزلہ؛ بڑی سی عمارت کھڑی تھی۔ جس کا رنگ ہمارے زمانے میں سُرخ ہوا کرتا تھا اور اب مٹ میلا ہو گیا تھا۔ چنار کے درخت البتہ ویسی ہی شان سے موجود تھے۔

گیٹ اندر سے بند تھا۔ آہنی کنڈے کو زور سے ہلایا۔ آواز سُن کر ایک نوجوان سامنے والے ونگ سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ جب وہ قریب آگیا تو میں نے اُس سے کہا۔

"تم چوکیدار ہو بھائی؟"

"جی ہاں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی، رحمانا۔"

"بھئی، ہم آج سے چالیس سال پہلے اس اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ اپنا اسکول دیکھنے آئے ہیں۔ تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم اپنا اسکول دیکھ لیں۔"

"ضرور دیکھئے۔" یہ کہہ کر رحمانے نے، چھوٹا سا آہنی گیٹ کھول دیا۔

گلشن اور میں رحمانے کے ساتھ اسکول کی بڑی سی عمارت کی طرف چل پڑے۔

"پُرانی عمارت تو وہ ہے۔ یہ بلاک تو ابھی کچھ سال پہلے بنے ہیں۔" اُس نے پرانی دومنزلہ عمارت کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کا گیٹ تو آخری چنار کے سامنے ہوا کرتا تھا۔"

"اُسے کئی برس پہلے بند کر دیا گیا تھا۔ ابھی پکّی سڑک کے پتھر بھی باقی ہیں۔"

"ذرا تالے کھول دو گے کروں کے؟"

"سارے کمروں میں تالے نہیں ہیں۔ ایک تالا اُس طرف ہے، سیڑھیوں کے پاس اور دوسرا تالا دوسری طرف کی سیڑھیوں میں کھلتے ہوئے کمرے کے دروازے پر ہے۔ میں دونوں طرف کے تالے کھول دیتا ہوں۔"

میرے ذہن کی حالت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ میں سیڑھیوں کے پاس رُکا۔ برآمدے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے زینے کی مٹی اپنی انگلیوں سے لے کر ماتھے پر لگالی۔ یہ منظر نہ کبھی رحمانے نے دیکھا تھا نہ گلشن نے۔ دونوں خاموش تھے۔

میں پہلے کمرے میں داخل ہُوا۔

یہ چھٹی جماعت کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔ آج بھی کمرے کے باہر لگی سیاہ رنگ کی چھوٹی سی تختی پر چھٹی اے لکھا تھا اور اُس کے نیچے طالب علموں کی کل تعداد، اور جو چھٹی پر تھے یا غیر حاضر تھے، اُن کی تعداد اور پھر اُن کی تعداد تھی، جو حاضر تھے۔ تاریخ ایک دِن پہلے کی تھی کیوں کہ آج اِتوار تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والا ڈیسک وہیں تھا، جہاں میں بیٹھا کرتا تھا۔ ڈیسک کے نیچے، پاؤں رکھنے کے لیے جو لکڑی تھی، وہ شاید پُرانی ہو جانے کے کارن ٹوٹ گئی تھی۔ اب اس کی جگہ نئی لکڑی لگا دی گئی تھی لیکن اس پر روغن نہیں کیا تھا۔ میں لمحہ بھر کے لیے، اُس ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ سامنے دیوار پر بلیک بورڈ بنا تھا۔ اُس زمانے میں تو لکڑی کا بلیک بورڈ ہوا کرتا تھا، جسے صاف کرنے کا کام کلاس کے مانیٹر کے ذریعے ہوتا تھا۔ میں چونکہ کبھی اپنی کلاس کا مانیٹر نہیں بنا تھا۔ اس لیے مجھے کبھی بلیک بورڈ صاف نہیں کرنا پڑا تھا۔

گلشن اور رحمانا دونوں خاموش تھے۔

میں جب کمرے سے باہر نکلنے لگا تو دونوں ایک طرف ہٹ گئے۔ میں برآمدے سے گذرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ برآمدے کے دونوں طرف کلاس رُوم تھے۔ دائیں ہاتھ والا کمرہ ساتویں جماعت کا تھا۔ میں کمرے کے سامنے رُک گیا۔ ساتویں اے کا کمرہ تھا اور باہر لگی سیاہ تختی پر طالب علموں کی ساری تفصیل درج تھی۔ کمرہ باہر سے بند تھا۔ میں نے خود ہی کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہی تو تھا کھڑکی کے ساتھ والا ڈیسک جہاں بیٹھ کر میں سامنے والے چنار کو دیکھا کرتا تھا۔ اُن دِنوں گھنے چنار کو دیکھ کر مجھے تحفظ کا احساس ہوا کرتا تھا۔ وہ احساس مجھے آج بھی ہوتا ہے۔ جبھی تو میں نے اپنی کتابوں کے اندر چنار کے سُوکھے پتے رکھ رکھے ہیں۔ کوئی اس کی وجہ پُوچھتا ہے، تو صرف ہنس دیتا ہوں۔ جواب اس لیے نہیں دیتا کہ آج کے سائنسی دور میں بے منطق جواب کوئی پسند نہیں کرتا۔

میں ایک بار پھر اُسی ڈیسک پر بیٹھ گیا ہوں۔ اور باہر کھڑے گھنی چھاؤں والے چنار کو دیکھنے لگا ہوں۔ جواب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے۔ کیا وہ لڑکا جو آج کل اس ڈیسک پر بیٹھتا ہے، اُس کی بھی اس چنار سے میرے جیسی ہی جذباتی وابستگی ہوگی۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہُوں۔

"شاید نہیں۔"

میں ڈیسک سے اُٹھتا ہوں تو گلشن کہتی ہے۔

"انکل آپ کی پینٹ تو مٹی سے خراب ہو گئی ہے۔"

"ڈیسکوں پر مٹی جم گئی ہے، حضور۔" رحمانا بڑی عاجزی سے اپنا جواز پیش کر رہا ہے۔

"اس مٹی کو تو چالیس برسوں تک ترسا ہوں رحمانے۔ اس مٹی میں ڈھکے، میرے دوستوں کے چہرے ہیں جو اب دُھندلا گئے ہیں۔ لیکن جن کے خد و خال میرے ذہن میں موجود ہیں۔"

گلشن اپنے چھوٹے سے رومال سے میری پتلون صاف کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور میں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے آگے بڑھ رہا ہوں۔ لگتا ہے، جیسے میں ابھی کل ہی اسکول کی عمارت چھوڑ کر گیا ہوں اور انہی کمروں سے اپنی کتابوں کا بستہ اُٹھا کر نکلا ہوں۔ اِسی لیے تو مجھے سب کچھ یاد ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بھولا۔

اور اب میں دُوسری طرف کی سیڑھیاں چڑھ کر آٹھویں لے کے کمرے میں آ گیا ہوں۔ عمارت کی دوسری منزل پر بھی وہ ڈیسک تھا۔ کھڑکی کے ساتھ والا۔ جہاں میں اور علی محمد بیٹھا کرتے تھے، جو دِن بھر اپنے فرن سے ناک پونچھتا رہتا تھا۔

"یہاں بیٹھا کرتے تھے، تمہارے ابا اور میں۔"

"سچ!"

"ہاں گلشن۔"

"آپ کو، اتنے برس بعد بھی یہ سب کچھ یاد ہے؟"

"تمہارے ابا کو بھی یاد ہے۔ وہ اسی لیے میرے ساتھ نہیں آیا۔ اُسے میرا درد بانٹنا پڑتا۔ بڑا چالاک ہے علی محمد۔" میں نے گلشن کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں کی دوستی بہت پکی ہے انکل؟"

"ہاں بیٹی۔" یہ کہتے ہوئے میں ڈیسک سے اُٹھا ہوں۔ اُس پر اپنا ماتھا ٹیکا ہے لمحہ بھر کے لیے اور پھر بڑی آہستہ سے کمرہ بند کیا ہے باہر سے۔ اور گلشن کا ہاتھ پکڑے سیڑھیوں سے نیچے اُتر آیا ہوں۔

اب وہ چنار میرے سامنے ہے، جس کے نیچے، علی محمد اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ مجھے ندرُو کے پکوڑے بہت اچھے لگتے تھے لیکن میرے والد مجھے کھانے نہیں دیتے تھے۔ علی محمد ہر روز ندرُو کے ٹھنڈے پکوڑے بستے میں رکھ کر لایا کرتا تھا۔ ہم دونوں اس چنار کے نیچے بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔

میں چنار کی چھاؤں میں گھاس پر بیٹھ گیا ہوں۔

"میں کرسیاں لے آتا ہوں جناب۔"

"نہیں رحمانے۔ ہم یہیں بیٹھیں گے۔ پھر کب نصیب ہو گی چنار کی یہ گھنی اور مہربان چھاؤں۔ اچھا تم ایک ایک کام کرو۔"

"فرمائیے؟"

"چنار کے سبھی درختوں کے نیچے سے، سوکھے ہوئے پتّے اکٹھے کر دو۔ صرف ایسے پتّے جو بالکل ثابت ہوں۔ ٹوٹے نہ ہوں کہیں سے بھی۔"

"اچھا جناب!"

یہ کہہ کر رحمانا چلا گیا ہے۔

"انکل! اِن سوکھے ہوئے پتّوں کو کیا کرو گے آپ؟"

"اِن پتّوں میں اُن تمام چہروں کو تلاش کروں گا، جو میرے دوستوں کے چہرے تھے، جن کے ساتھ میری بڑی ہی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔"

"ابّا کا بھی چہرہ ہوگا اِن میں؟"

"وہ تو ہوگا ہی ـــ مجھے یاد آ رہا ہے، اسی چنار کے نیچے بیٹھ کر، ایک دن علی محمد نے اپنے فرن سے، میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو گرمی دی تھی۔ جن پر ہمارے کلاس ٹیچر نے بڑے زور کی کیننگ کی تھی۔ اُس دن پہلی بار مجھے علی محمد کا فرن اچھا لگا تھا۔ گلشن! جس سے وہ دن بھر ناک صاف کیا کرتا تھا۔"

"کیوں ہوئی تھی آپ کی کیننگ، انکل؟"

"میرے کسی قصور پر، لیکن ماسٹر جی کو بہت افسوس ہوا تھا، بعد میں۔"

رحمانا لے آیا تھا چنار کے سوکھے پتّے، سبھی درختوں کے نیچے سے اُٹھا کر اُس نے اُنہیں ترتیب سے رکھ دیا تھا۔ اور ایک پرانے اخبار کے کاغذ میں بھی لپیٹ دیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ رحمان جُو۔ میرا ایک اور کام بھی کر دینا۔"

"فرمائیے جناب۔" لگتا تھا رحمانا بڑا مہذب نوجوان تھا۔ وہ بیج بہاڑا کا رہنے والا تھا اور دسویں پاس تھا۔

"آٹھویں اے کلاس کے سب لڑکوں کو کل لڈّو کے پکوڑے کھلا دینا میری طرف سے۔" میں نے رحمانے کی طرف پچاس روپے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بتاؤ، تمہارا کوئی بچہ بھی اسکول میں پڑھتا ہے؟"

"جی، میری بچی پڑھتی ہے، بیج بہاڑا کے اسکول میں۔"

"اُسے میری طرف سے کوئی خوبصورت تحفہ دے دینا۔" میں نے پچاس روپے کا ایک اور نوٹ اُس کی طرف بڑھایا۔ رحمانا حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"اچھا خدا حافظ، رحمان جُو۔" میں نے رحمانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو دبوچ کر، اپنے ماتھے سے لگا لیا۔

گلشن اور میں گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گیٹ پر رُک کر، ایک بار میں نے اسکول کی پرانی مٹ میلی عمارت کو اور گھنی چھاؤں والے مہربان چناروں کو سلام کیا۔

اور جب میں نے گیٹ کو آہستہ سے بند کیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے چناروں کے سوکھے پتوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں انکل؟" گلشن پوچھ رہی ہے۔

"جب تمہارا بیاہ ہوگا اور تمہارے ابا تمہیں گھر سے رخصت کریں گے تو تمہاری آنکھوں میں بھی آنسو آئیں گے بیٹی۔"

یہ کہہ کر میں نے گلشن کو اپنے ساتھ چمٹا لیا ہے۔

میرے اسکول کا گیٹ بند ہو گیا ہے۔

اور دوسری طرف رحمانا بڑی محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور میرے اسکول کا سب سے آخر والا چنار اپنی خاموش اور مہربان آواز میں مجھے دعائیں دے رہا ہے۔!!